

# غالب

نظر اور نظارہ

ڈاکٹر حنیف فوق

ادارۂ یادگار غالب کراچی

غالب

نظر اور نظارہ

# غالب

## نظر اور نظارہ

ڈاکٹر حنیف فوق

ادارۂ یادگار غالب  
کراچی

## سلسلے مطبوعات ادارۂ یادگار غالب

شمار: ۳۳

طبع اول :	۲۰۰۳ء
صفحات :	۱۷۶
طابع :	احمدیہ اوز، ناظم آباد، کراچی
تعداد :	۴۰۰
قیمت :	ایک سو بیس روپے (= ۱۲۰/-)

☆

## ادارۂ یادگار غالب

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۶۸  
ناظم آباد۔ کراچی ۷۴۶۰۰

☆

## غالب لائبریری

دوسری چودنگی۔ ناظم آباد نمبر ۲  
کراچی ۷۴۶۰۰

## فہرست

۷	دیباچہ
۹	غالب اور سلسلہٴ نظر
۲۷	غالب: نظر اور منظر
۵۵	نظر غالب اور نگارہٴ عصر حاضر
۶۷	غالب اور غالب کی ایک غزل
۸۳	غالب اور نقشِ نوآئین
۹۹	جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے
۱۱۳	افسانہ طراز غالب
۱۲۹	غالب کا تھوہرا انسان

## دیباچہ

ہر بڑا لکھنے والا، پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ البتہ اُس کی بڑائی کی ہمیں رفق و رقت کھٹکتی ہیں۔ ابتدائے شعور ہی سے غالب کی گرفت مجھ پر مضبوط رہی ہے۔ شاید یہ وہ زمانہ تھا کہ غالب کے اثر سے بچا نہ جاسکتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ اثر گہرا ہوتا گیا کیونکہ غالب کی شاعری میں اپنے وقت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ہر وقت ہاتی رہ جانے والی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ غالب کو سمجھنے کے لیے متعدد شرحوں کا مطالعہ بھی کیا۔ لیکن رفق و رفیق یہ واضح ہوتا گیا کہ متعدد معنوں ہی سے غالب کے شاعرانہ شعور کی توضیح نہیں ہوتی۔ غالب کا شعور تو ایک ایسا شعور تھا جس نے شعری رجحانات ہی میں اکتفا نہ بلکہ زندگی کی تمام مختلف ذوا یا صورتیں نظر سے کیا۔

غالب اپنی شاعرانہ شخصیت کے اعتبار سے ایک مختلف انسان تھے۔ ایک ایسا انسان جسے کسی بے بنائے قالب میں ڈھالنا محال تھا۔ انھیں شاید ہر زمانہ مطلوب نہ کر سکے اور اُن کے متخیلے نے زندگی سے اخذ و استساپ کے سلسلوں کو متعدد جہتوں میں نئی صورتیں دیں۔ وہ فلسفیانہ تصورات ہوں، جہالبیاتی اقدار ہوں یا انسانیاتی کوائف غالب نے زندگی کو متعدد ذراویوں سے دیکھا ہے۔ لیکن یہ سب ذراویے مل کر زندگی کی گہری طرح کھولتے ہیں، اُن سے یہ حقیقت جمجھکی انسان کی ترجمانی ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری کا سب سے اہم موضوع ہی انسان ہے اور اس انسان کو اپنی فکری وسعتوں کے ساتھ جس طرح غالب نے پیش کیا ہے، اُس میں مستقبلِ بنی کی صفت بھی ملتی ہے۔ وہ اپنے عصر کو آنے والے مصر کی روشنی بخشتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حال کی زندگی کے کرب، آزمائش اور تضاد کا احساس جیسا غالب کی شاعری میں ملتا ہے، وہ ایک منفرد حیثیت رکھتا

ہے۔ اس لحاظ سے غالب نے خارجی احوال کو جس طرح اپنی شعری بحالیاں اور داخلی کیفیات کا حصہ بنایا ہے اور اُس میں اپنی خلافتِ قوت سے نئے رنگ بھرے ہیں، وہ اردو شاعری بلکہ عالمی شاعری کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔

غالب پر صرف برصغیر پاک و ہند ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان بیان کردہ باتوں کی نگرانی سے کچھ حاصل نہیں۔ البتہ غالب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے انہیں خوش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ چند مضامین جو پیش کیے جا رہے ہیں، ان میں کوشش رہی ہے کہ مطالعہ غالب کے کچھ نئے گوشے اور اُن کے شاعری کے کچھ نئے زاویے سامنے آئیں۔ ان مضامین میں غالب کے سلسلۂ نظر، نظارہ اور منظر کو پیش کرنے کی کوشش کے ساتھ اُن کے تصور انسان کو نمایاں کرنے کی سعی ملتی ہے کہ میرے خیال میں اُسے تفہیم غالب میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

اگر غالب کو صرف مثنیٰ شاعری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو میری دانست میں مطالعہ غالب کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اس مثنیٰ کا رشتہ غالب کی انفرادی فکر اور اُن کے ماحول سے جوڑنا بھی ضروری ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں جن احباب کرام کا اصرار اور اعانت شامل رہی ہے، اُن کا شکریہ ادا کرنا میرا خوش گوار فریضہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اصرار اور اعانت کے بغیر ان دنوں فوتہا شائع شدہ مضامین کو جمع کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں، تقریباً ناممکن تھا۔

غالب ہمارے تہذیبی شعور کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان چند مضامین میں غالب کے تہذیبی حراچ کو جاننے کی جو ناچیز کوشش ملتی ہے، وہ شاید بعض اُن اجزا کی دریافت میں مدد کرے (اور لکھنے والوں کی جانب سے مزید تحریروں کا باعث ہو) جسے ہم نکلی طود پر اور وسیع ترین معنوں میں انسانی تہذیب کہتے ہیں۔

عطیہ فوقی

## غالب اور سلسلہ نظر

غالب برصغیر کی تہذیبی روایت میں آگہی کی ایک نئی سمت ہیں۔ ان کی شاعری تحریر نے کئی مباحث کا آغاز کیا ہے۔ وہ دہلی میں رہتے ہوئے ایمان و قرآن سے اپنا سلسلہ ملاتے ہیں لیکن اردو غزل کو نہ بیچ احساسات، نازک تعلیلات اور عینیت افکار کی دولت بخشتے ہیں۔ ان کی اردو و فارسی، نثر و نظم، فرو و معاشرہ دونوں سطحوں پر خیال کی شروعات میں اضافہ کرتی لیکن ساتھ ہی ذات اور ماحول کے تضادات کو آئینہ بھی دکھاتی ہے۔ ان کی شاعری حدود جہتوں کی شاعری ہے۔ جس میں تحریک افکار اور جمہوریت اقتدار سے لے کر گزشتہ تاریخ و تہذیب کے مثبت و منفی اثرات تک کئی عناصر ملتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت جمہوری، وہ انسان کی ان اہمگوں اور آرزوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو زندگی کی کھن راہوں میں روشنی اور گرمی کا باعث ہیں۔ ان کی اپنی شخصیت میں روایت کی پختگی، زندگی کی رنگ رگی اور معاشرے کی ترقی پذیری بھج ہوئی ہے۔ ان کی ذات کی نیرنگی، بدلے ہوئے حقائق کی بدھلونی سے مل جاتی ہے۔ چنانچہ ذہن کی جھپکی نے معاشرے کی تعمیر پذیری سے ہم آہنگ ہو کر جن ادبی صورتوں کی تخلیق کی ہے، وہ نہ متعین بھی ہیں اور صورتات و معیارات کے اعتبار سے انقلاب آفریں بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ غالب کو وقت اور حالات کے درمیان انسانی صورت حال کے تناقضات اور خیالات کا احساس بھی رہتا ہے۔ چنانچہ جہاں وہ آزادانی ضم کی مبارک یاد دہیتے ہیں کہ



ہر طرف معلق دام ہوائے گل ٹوٹے پڑے ہیں، وہاں وہ درمائیگی میں کچھ نہ کر پائے کی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے، یہ بھی کہتے ہیں کہ ”جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کھٹا تھا۔“ ان زیادہ گہرے، زیادہ وسیع، زیادہ وسیعہ اور زیادہ حقیقت شناسانہ خیالات کی ادائیگی کے لیے جامع اظہار تک تھا۔ غالب نے اپنے مشاہداتی احساس کو تصوراتی ابداع تک پہنچاتے ہوئے، اظہار کے جو پیرائے اختیار کیے، وہ داخلی اور خارجی رشتوں کے ایسے نازک رابطوں پر مبنی تھے کہ اپنی تجرباتی صورتوں میں بہت سے چارنیم کے لیے غیر مانوس رہے اور اپنی مانوس روایت متداول صورتوں میں جن کی پُرکاری اور تہ داری نظروں سے اوجھل رہی۔

مطالعہ غالب کا سلسلہ ایک زمانے سے جاری ہے۔ واصل اویسیں غالب شناس، وہ تحریف نگاران غالب تھے جو ناخن قوی قزح پر جہ مضرب ہونے یا نہ ہونے کا قیاس کر رہے تھے اور غالب کے اشعار کی تحریف کرتے ہوئے وہ عدم مناسبتوں کے ذریعے، بے جانے ہوئے، امکانات خیال اور وسائل اظہار کی دشوار مطابقتوں کا اشارہ کر رکھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کی شاعری، شروع سے آخر تک، ایسی نہیں کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو کبھی نہ کسی بازگشت یا انعکاس سے مشکک کیے بغیر گزر جائے۔ اس شاعری نے خواہ کتنے ہی رنگ بدلے ہوں اور اس کی قبولیت یا ناقبولیت کے بارے میں کوئی فیصلہ ہی کیوں نہ کیا جائے، قاری کا ردِ عمل ہر صورت میں شریک ذات کی جذبات لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ طرف داری کے الزام سے بچنے کے لیے خود غالب کو سخن جہی کا دعویٰ کرنا پڑا تھا، اور میرزا یگانہ جیسے خاصہ خاصانِ ادب نے آیات و تراویح کی غالب نما بلندیں کو جتانے کے لیے ”یگانہ آرٹ“ کا پرچم بلند کیا تھا۔ غالب نے تو اپنے ہر شریک کو شریک غالب بتایا تھا، لیکن حسین یا حقیق، دونوں جانب ٹٹکنے والوں کو، ذاتی جذبات سے باہل کرنے میں، غالب کی شخصیت، شاعرانہ شعور، طرز اظہار، انکار، تصورات اور ایک دوسرے سے متصادم و متکرب ذہنی جہات کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

اردو میں ادبی معرکوں کی روایت قدیم سے موجود ہے۔ لیکن یہ معرکے بڑی حد تک ہنگامی اور وقتی نوعیت کے حامل ہوئے ہیں۔ معاصرانہ چٹک تو ہر بڑے کلمے والے کا نصیب رہی ہے۔ لیکن جلد یا کچھ مدت بعد ان کی بڑائی کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف غالب کو بڑا شاعر ماننے ہوئے بھی ان کے فکر و فن کی چھان بین کے لیے بحث کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تھرکا معتقد ہونا بلندی ذوق کی نشانی ہے اور سچ یہ ہے کہ ان کی انسانی دروندی چپ چاپ دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ اسی طرح اقبال کے کلام کا شکوہ و احتشام، احتراؤ سر نہ کھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن یہ غالب کی شاعری ہے، جو چھوڑتی ہے، دعوتِ مبارزت وقتی ہے اور متعدد مقامات پر مصدرات پیشیں کو رو کرتے ہوئے، نئی نسلوں کے لیے صلائے عام بنتی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ غالب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ذاتی وارداتوں، مصری شہادتوں اور آفاقی صداقتوں، سب پر شاعر کی محتاتی شخصیت کا پرتو پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جس کی میر، انجم خصوصیت، حضور و خصوصیت کے متضاد رویوں کو چمکاتی ہے۔ غالب کی لفظیات میں محتائیت کی صفت دیکھنے والے تعریف نگار ہی غالب کی شاعرانہ شخصیت کے پہلے رخ شاس تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس معائیت کی جزیں زیادہ گہری تھیں اور ان کی شخصیت سے بیست تھیں۔

غالب کی اولیں معائیت اور بعد کی کثیر الجہاتی صرف بیان کی حدود تک محدود نہیں تھی اور ان کی پیچیدہ شخصیت کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی ایک ایسے معاشرے کا عکس تھی جہاں اندازِ وقت کی بھٹی میں پگھل کر نئی صورتوں میں وصلتی جاری تھیں۔ غالب کا تجرباتی ذہن اور ان کے فنی رویے اس جدلی کا مظہر بن گئے تھے۔ ان کی شاعری محض خیال بندی نہیں تھی۔ وہ خیال آرائی سے گزر کر خیال آفرینی تک پہنچتی تھی۔ پھر ان کے خیالات کے ساتھ اسے حقیقت و اہستہ تھے کہ آج بھی سیدھے سہاؤ ان کا مطالعہ مشکل ہے۔ خیال بندی کرنے والے تاریخ تھے اور غالب سے ان کی مراحضیں تلاش کی گئی ہیں، جو ایک حد تک صحیح بھی ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کے ہم عصر

ہم شہرِ مومنِ دشتِ نگاری میں شہرت رکھتے تھے۔ لیکن غالبؔ کی دشتِ اعتبار نہ صرف لفظی ویر پیمیر سے عہادت ہے اور نہ محدود کوائف سے منسلک۔ اس سے زندگی کے جس سلسلے رواں کا احساس ہوتا ہے، وہ محدود و محدود گیر ہے اور اس کی زد میں بہت ہی قدیم چمک ڈھریاں اور حال کے راستے ہیں۔ حنفیہ زندگی کے اس وسیع تجربے کو غالبؔ نے اپنی ہماری شخصیت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ اسے شاعرانہ تصور کی حرکت میں لانے کے لیے غالبؔ کو کتنی ہی سرلیج الاثر اور دیرپا ذہنی حالتوں سے گزرنا، بکھرنا اور اپنے آپ کو جمع کرنا پڑا۔ حیثیتِ نازک اور صہبانے آگہیہ گداز ہو یا زہرِ غم ہو اور تلخی کام و دہن، غالبؔ نے نوٹے اور بننے کا تماشا کیا ہے۔ پھر اس تماشے کو عرضِ فکر بنانے میں انہوں نے اعتبار کے متعدد ٹر آزمائے ہیں۔ اس سب کے نتیجے میں جو فن وجود میں آتا ہے، وہ اپنی الگ، بے اہمائی دل کشی، فکری اطراف اور ذہنی تصویروں کا سلسلہ رکھتا ہے۔

غالبؔ کی شاعری ابتدائی سے اس کا سراغ دیتی ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کے بدلنے ہوئے رنگوں پر غور کرتے رہے ہیں۔ اُن کے زمانے میں جو رنگِ سخن بطور وسیع و دربار یا وسیع عہد اختیار کیا جا رہا تھا، غالبؔ اُس سے الگ ہیں۔ شاعرانہ اعتبار سے اُن کی ابتدائی بے راہ روی کا بیان ہوتا رہا ہے، لیکن اس بے راہ روی میں بھی راہوں کی تلاش کا عنصر موجود ہے۔ بیدلؔ سے یکاگرت محسوس کرتے ہوئے بعض ایسے اشعار اُن کے قلم سے نکلے ہیں، جنہیں غالبؔ نے خود بعد میں رد کر دیا ہے، لیکن آج اُن میں سے بعض میں مفہوم کے جہانِ تازہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور کے بعض اشعار کی نسبت روایتی طعانات کے پردے میں بھی فکری وہ تحریر جھلک رہی ہے جو فلسفہ ہی نہیں تمام ذہنی جستجوؤں کا منبع ہے۔ اس کے ذریعے غالبؔ اس احساسِ لامصلی تک بھی پہنچے ہیں جو بعض فکری سلسلوں کی آخری منزل ہے اور جسے بعد میں وہ ”کافِ دانشِ فلفہ و نفعِ مہادتِ معلوم“ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

تمثالِ گداز آئندہ ہے مہرِ بخشش

نظارہٴ حقیر، چمنستانِ ہنر

اس پوری نوزل میں عجزِ قنار اور سچ کاری کی جو گہری لے ملتی ہے، اسے غالب نے ”آہنگِ اسد میں نہیں جزِ قنار بیدل“ سے تعبیر کیا ہے، لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک نو عمر لیکن مقتدر الفکر شاعر نے بیرونی بیدل کو اپنے لیے بہاتِ ارشاد بنایا ہو، جس طرح اسے بعد میں استادِ قاری دانی کے لیے ایک حقیقی یا فرضی استادِ ملا عبدالمصدق کا نام لینا یا قصہ تراشنا پڑا تھا۔ جس کا ان کے یہاں انکار بھی ملتا ہے۔ غالب کے ان دونوں بیانات میں تضاد، سچائی کے لیے نہیں بلکہ اس معاشرتی و ذہنی کے لیے حقارت کا پہلو لیے ہوئے ہے جو ہر حقیقت کے لیے کسی جواز کی محتاج رہتی ہے۔ غالب نے بیدل کا جو سہارا و محفوظ حاق تھا، اسے بھی جلد ترک کر دیا۔ وہ بیدل ہی نہیں متعدد قاری گو شعرا کے حلقہ اثر سے نکل گئے اور ان کی شاعری میں وہ رنگ آیا جسے غالب کا خصوصی رنگ کہا جاسکتا ہے۔

اکبر آباد نہتا برج بھاشا سے زیادہ تعلق رکھنے والا اور دہلی گہری بولی کا علاقہ رہا تھا۔ اردو شاعری کی ارتقائی تکمیل میں رہنمائی نے ایران کا اثر قبول کرتے ہوئے بھی برصغیر کی تہذیبی سرزمین پر کھڑا ہونا سیکھا تھا۔ میر اور حافظ یا درد اور عراقی کے اشعار میں بعض مشابہتوں کے باوجود انفرادی مزاج اور اجتماعی فضا کے اعتبار سے نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ خود قاری گوئی کا دائرہ ایران کے علاوہ افغانستان، ترکی، وسط ایشیا اور برصغیر تک پھیلا ہوا تھا لیکن سبکِ ہندی کی جداگانہ حیثیت بھی جاتی تھی۔ غالب برصغیر کے محدودے چند قاری گوئوں کو ضرور مانتے ہیں لیکن اپنا سلسلہ ایرانی روایت سے قائم کرتے ہوئے، وسط ایشیائی تہذیب کی یادوں تک پہنچتے ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے برصغیر میں قائم شدہ روایات کا رد اور پرانے نگری سلسلوں تک رجعت تھی۔ لیکن اس بات کو نثر میں رکھا جائے کہ برصغیر کی تہذیب، زوال اور انفعال کی کن منزلوں سے گزر رہی تھی تو غالب کا خاکِ پاک تو رمان کو یاد کرنا سمجھ میں آجاتا ہے اور ان کی اس ذہنی توانائی کا راز کھلتا ہے جو ”ہند پروردگار می بخندیم“ ”ہا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم“ اور ”مزد و صبح دریں حمیرہ شایم دادند“ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن غالب کی اردو شاعری رجعت

سے زیادہ رجوع کا نشان ہے۔ غالب کے اپنے فارسی کلام کو "مختص ہائے رنگ رنگ" اور مجموعہ اردو کو "بے رنگ" کہنے کی تان، واصل ذوق کی ہم عصرانہ چٹک ہے، اس پر فوجی ہے کہ "ہر چہ در گفتار فخرست، آں نیک مست" لیکن یہ غالب کا فارسی کلام نہیں، ان کی اردو شاعری ہے، جس میں داغِ فراقِ محبوبِ شب کی بجلی ہوئی غموشِ شمع ملتی ہے اور سینہ جو پائے دلمِ کاری رہتا ہے۔ ان کی اردو شاعری میں خیال و جذبہ کی ہم آہنگی کے ساتھ جو فارسی کا ترکیبی احراج ملتا ہے، وہ ایک تہذیبی مزاج کے غالب اثرات کے باوجود دوسری تہذیب کے مطلوب نہ ہونے کی نشانی ہے۔

غالب نے اردو شاعری کی اس "اردویت" کو تو قبول نہیں کیا جو سامنے کی باتوں کو لطیفِ محاورہ اور روزمرہ کے ساتھ بیان کر دینے پر مبنی تھی۔ کیوں کہ سنیاں سے گریز، درحقیقت زندگی کی چٹکتوں سے فرار کے مترادف تھا۔ لیکن خیال و زندگی کا سامنا کرنے کی ہمت کے ساتھ ساتھ غالب کی اردو شاعری میں آشکار وہ لطافتِ انکھار بھی آگئی کہ "سلسلۂ غالب" (بقول غالب) دھبہ فارسی بن گیا۔ غالب کا حلقی جو ہر ان کی رنگارنگ شخصیت کی تیرگی لیے ہوئے اور ان کی اردو شاعری اس جوہر کی عکاسی کرتے ہوئے، تعمیر پذیر تاریخ اور رواں سلسلہ تہذیب کی تربیتی بھی کرتی ہے۔ اس تاریخ اور تہذیب نے مغلیہ دور میں نفائس اور دھاکتی کے کئی روڈن بیتار استوار کیے تھے، جن کی نگہداری نگارشاتِ غالب میں ملتی ہے۔ لیکن غالب صرف باطنی کی حکمتوں اور حال کی صورتوں ہی کی نہیں، مستقبل کی روشنیوں کی جھلک بھی پیش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر وہ گزشتہ تہذیبی تربیات کا نقطہ اختتام ہیں تو ان کی شعری حیات نئے دور کی تراویحات کا نقطہ آغاز بھی کہی جاسکتی ہیں۔

غالب کی شاعری میں جس حرکت کا احساس ہوتا ہے، وہ انفرادی رشتوں کے تصورات کو بدلتی، قائم شدہ شخصیات سے اوپر اُٹھتی اور مشاہدات و تجربات کو نئی دہنی سمجھ دیتی ہے۔ اس میں ایک جزو پیشِ بنی بھی شامل ہے۔ یہ تو شاید صحیح کہا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ عظیم کے اثرات غالب کی شاعری میں کم نظر آتے ہیں۔ اپنے

غالب۔ شعر اور سحر

خطوط میں تو وہ انسان تو انسان، سنگ و خشت کی برہادی کے بھی باقم کناں نظر آتے ہیں۔ لیکن شاعری میں ایک قیض، چند اشعار اور بعض اشاروں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ تحقیق کی آنکھ صرف یہی دیکھ سکتی ہے لیکن غالب کے کلام کا تنقیدی تجزیہ بتاتا ہے کہ انہیں وقوع پذیر ہونے والے جس زوال کا احساس تھا، اس کا مرثیہ تو وہ بہت پہلے سے لکھ رہے تھے اور عظمت کدے میں صہب غم کے جوش کے اشعار کو اگر ۱۸۵۷ء سے تئیں پانچ اکتیس سال پہلے کا ثابت بھی کر دیا جائے، تو اس سے ان کی شاعرانہ بصیرت اور نمایاں ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ۱۸۵۷ء سے پہلے وہ امام تہجد بننے والے سرسبز کی مرتبہ بھیج کر وہ ”آئین اکبری“ کی تقریظ لکھتے ہوئے انگریزوں کے درپے متعارف ہونے والے دور جدید کے ٹکٹن گاتے اور ”آئین دگر“ کو ”تقویم پار“ قرار دیتے ہوئے ”مردہ پروردن، مبارک کار نیست“ کا فیملہ سناتے ہیں۔

غالب کی شاعری کی بدلتی ہوئی دھنیں جو صبر خیال کی دیواروں کو ہلا دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اپنے وقت کا مرثیہ بھی ہیں اور آنے والے دور کی اطلاع و انتباہ بھی۔ ایک جانب وہ قدیم تہذیبی عظمت کا پاس رکھتے ہوئے، وقت کے بدلنے ہوئے دھاروں کے مقابلے میں اجتماعی بے بسی کی یہ تصویر کھینچتے ہیں کہ:

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم

ہو غم ہی جاں گداز تو غم غوار کیا کریں

تو دوسری طرف تقدیر سے ہار نہ ماننے والی انسانی جدوجہد کو پیش کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں ناکل

جب آنکھ ہی سے نہ چکا تو پھر لہو کیا ہے

حیرت اس پر ہے کہ بہت برسوں بعد رونما ہونے والی سیاسی صورت حال کا کوئی نقش بھی موجود نہ ہوتے ہوئے وہ فیض کی ”پردہ شمع لوح و قلم“ اور خواجہ دل میں اگھیاں ڈال لینے کے دو مضامین کو یکجا کرتے ہوئے، زیادہ وسیع مفہوم اور نثر شاعرانہ

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں پکاس

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

لیکن یہ شاید موجبِ حیرت نہ ہو اگر وقت کے تمام راستوں میں انسان کی ہر جہت سے جاری رہنے والی جدوجہد کا عالمِ غالب کے شاعرانہ شعور سے تعلق، دریافت ہو جائے۔ سیاسی آزادی کا حصول اور جمہوریت کا قیام تو اس جدوجہد کے دو رخ ہیں لیکن اس کے دائرے کی وسعتوں میں (اور خود جمہوریت کے مقصدِ اعلیٰ کے اعتبار سے) تو ”بہارِ کشائے گستاخِ حیات“ کا نظارہ اور آدمی کا انسان بننا بھی شامل ہے۔ شاعری کے موسم بدلتے رہتے ہیں اور انقلابی حرکت سے وجودی لامحالیت تک محدود انکار نے تخلیق کے تاروں کو پھیرا ہے۔ لیکن بدلتے ہوئے ماحول میں خود کو اور حالات کو بدلنے کی صلاحیت کے حامل انسانی وجود کی داستانِ امید و یاس سنانے والے عالمِ غالب کے کلام کی تازہ کاری میں کمی نہیں آئی ہے۔

عالمِ غالب کے شاعرانہ شعور کا ان کی برہمنوں شخصیت سے کیا تعلق ہے؟ کیا ان کے یہاں کوئی نظامِ فکر یا منظم فلسفہ ملتا ہے؟ ارسطو نے دماغ کے لیے حیاتی نقطہ Nous کی جو تعبیر کی تھی، اس کے مطابق اس کے متقی عقلِ منطقی، منطقی زندگی یا غور و فکر کی سطح پر گزاردی ہوئی زندگی ہو سکتے ہیں۔ اس نے اس صفت کو طاقت بھی کہا ہے۔ اسی صفتِ عقلی کو برٹریڈ رسل نے پاشور ہونے کی صفت قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض فلسفیوں نے اسے صفتِ رابطہ بھی کہا ہے۔ لیکن یہ تمام تعریفیں گویا ذہن یا دماغ کو ماحول یا تہذیب کے عوامل سے بڑی حد تک الگ از فکر قیاس کرنے پر مبنی ہیں۔ حالانکہ دماغ ان عوامل سے ایسا پیوستہ ہوتا ہے کہ اس کا ان سے جدا کرنا، عالمِ غالب ہی کے لفظوں میں گوشت سے ناخن کا جدا کرنا، بن جاتا ہے۔ پھر یہ خیال رہتا چاہیے کہ شاعرانہ عمل محض منطقی عمل نہیں اور موضوع، جذبے، بھولی ہوئی یادوں اور شاعرانہ زبان (جس میں خواب ناک، ٹیکر آفرنی یا تھمال سازی اور توسیع کاری استعمال بھی شامل

عالم... نظر اور نگار

ہیں) سے مل کر اپنی جداگانہ منطق کی تعمیر کرتا ہے۔ دوسری طرف ایسے لال بہتو بھی ہیں، جو صرف ”زبان لگتی ہے“ کہنے پر اکتفا نہیں کرتے، ”زبان سوچتی ہے“ کہہ دینے میں بھی انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ گویا وہ سوچنے والے ذہن کو سوچنے کے عمل سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔ عالم کی شاعری میں ہر لمحہ ایک سوچنے والے ذہن کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ ذہن زندگی کے ہنگاموں میں پوری طرح شریک ہے اور اسی شرکت سے اس کی سوچ میں وسعت آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عالم نے ”پہلے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے“ کی آرزو بھی کی تھی۔ لیکن یہ آرزو، اسی قبیل کی تھی کہ جس کے تحت مونتگو (Montague) نے کہا تھا کہ ”میں اس وقت سب سے زیادہ سوچتا ہوں جب چٹ لینا ہوا، چیزیں، دیکھتا ہوں۔“ ”دیکھنے کا یہ عمل عالم کے یہاں دیکھنا کا ایسا عمل بن جاتا ہے کہ قطرے میں دجلہ اور جزو میں گل دکھائی دیتا ہے۔ عالم کی شاعری میں دیکھنا صرف جانتا نہیں ہے بلکہ اس میں وجود کی پوری گہرائیوں کے ساتھ محسوس کرنا بھی شامل ہے۔ اس محسوس کرنے میں مخصوص وارداتی اور واقعاتی صورتوں میں جاننے کی فنکاریں بھی بدلتی رہتی ہیں اور تخصیص میں تعمیم اور تعمیم میں تخصیص سے جو ذہنی مہمیں ابھرتی ہیں، ان کے ہر جزو کو ایک دوسرے سے مربوط نظام فکر میں نہ کسی مربوط نظام تاثر و تحفیل میں لانا، ”نیرنگ بے تابی“ کو ایک صورت دینے کی طرح دشوار ہے۔ عالم اجزائے نگہ، اجزائے خبر اور پھر خود جلوے کی مسافتوں کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خبر نگہ کو، نگہ چشم، کو عود جانے

وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

عالم کی شاعری میں کثرت آرائی وحدت اور اعنام خیالی نے تصورات کی رنگ رنگی پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ فطرت، انسانی ذہن کے نگارے میں واحد تصور بن کر بھی ابھر سکتی ہے۔ لیکن عالم کو اس کے بدلنے ہوئے جلوے عزیز ہیں۔ اس میں ان کی اپنی طبیعت کا انداز شامل ہے لیکن وقت کے ساتھ اقتدار کی تعمیر پذیری کے احساس



کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بخشے ہے جلوہ گل، ذوق تماشا غالب

ہنرم کو چاہیے، ہر رنگ میں وا ہو جانا

غالب کی شاعری میں جو فکر کے کئی رنگوں کو پیش کرتی ہے، کسی ایک فلسفہ حیات کی تلاش بے سود ثابت ہوئی ہے۔ وہ صرف "عالم تمام حلقہ" نام خیال ہے" ہی کے قائل نہیں، "مخالفات بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" کی تصویر بھی دکھاتے ہیں۔ تصوف سے لے کر مادیت اور عینیت تک کھلی ہی ذہنی لہریں، ان کی شاعری کو اضطراب بخشتی ہیں۔ لیکن جہاں یہ اضطراب حقیقی ہے، وہاں ایک بات اور نمایاں ہوتی ہے کہ شخصی طور پر وہ خیال کی اگلی سے اگلی بلندیوں تک پہنچتا اور یہ یک دقت زندگی کی تمام لذتوں سے دامن بھرتا چاہتے ہیں۔ ان دونوں میں جو کشش ہوتی ہے، وہی ان کے شاعرانہ اضطراب کی بنیاد ہے۔ کسی نہ کسی طور پر یہ کشش ہر انسان میں ملتی ہے اور اسی لیے غالب کی لذتِ فقر میں شے والوں کا مذاقے دلی شامل رہتا ہے۔ لیکن غالب کے یہاں مسجدِ عالی کی وحشت پر عرصہ آفاق تنگ ہونے لگتا ہے اور گناہ و حسرت گناہ کے دھوے "زور و رسمِ ثواب" سے مغرور کر کے "نیز حاکم ہے قد قلم سرلشت کو" کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ الین نے ادب یا شاعری کو شخصیت کے اظہار کا نہیں، فرار کا ذریعہ بتایا تھا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا فرار کی مخصوص راہیں، خود شخصی خصوصیت سے بے تعلق ہوتی ہیں؟ فرار اور قرار دونوں میں وہ شخصیت محفوظ رہتی ہے، جو دقت اور حالات کے ساتھ بدلنا اور ترقی پانا بھی سیکھتی ہے۔ آدمی صرف اپنے اعمال ہی سے نہیں، اپنے خواہوں سے بھی پہچانا جاتا ہے اور اس کی مجموعی شخصیت کی تعمیر میں دونوں شریک ہوتے ہیں۔

غالب کی خواہشات اپنے ماحول و دقت کے حدود سے نکل جاتی ہیں اور ان کے خواب انسان کے آغاز و انجام کی خبر لاتے ہوئے، قائم شدہ تصورات کائنات سے متصادم ہوتے ہیں۔ روایت سے بغاوت اور آزاد خیالی تو محض سطحِ آب کی لہریں ہیں،

عالم... نظر اور طالع

دراصل تصادم کی لذت تو ان کی تخلیقی شخصیت کے مرکزی حصے میں وہ طوفان برپا کرتی ہے کہ شب و روز کے تماشے پر نظر رکھنے والا یہ جائداد ہوائے سرگمذاں خود وجود کو تک وجود ٹھہرانے لگتا ہے اور شخصیت کا ہر لباس اس کی ذات کی عربیائی کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ڈھانچا کفن نے داغ صیوب برہنگی

میں درنہ ہر لباس میں تک وجود تھا

عالم کے وسیع شاعرانہ شعور کو محض ان کی ذہانت کا نتیجہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے صرف ان کے شخصی اعمال یا طبعی اکتسابات سے جانچا جاسکتا ہے۔ عالم کے دور کے سماجی حالات، ان کی نظر بننے میں معاونت ضرور کرتے ہیں اور انہیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اس نظر میں مشاہدے سے تصور اور تصور سے ترشح تک ہر دلی کرب اور اضطراب شامل رہا ہے، وہ حسی و دیوانگی سے بھی زیادہ برتر درجے میں، خواب و حقیقت، نکلاد و غم اور حسی و سرشاری کی ان متضاد کیفیات کا حامل ہے جو بالآخر صبر اور موارے عصر کی شاعرانہ قرنائی میں ڈھل جاتی ہیں۔ عالم کی شخصیت اپنے ماحول کے تضادات کی دیواروں میں قید ہونے کے باوجود کیسے "مندیپ گھٹن نا آفریدہ" بن جاتی ہے۔ اسے جاننے کے لیے صرف گہری نگاہ تصور ہی نہیں، آنکھ کد، دل اور نفس آذر فکس کا چارہ بھی لینا ہوگا، گزر جانے والے زمانے کی سرگشت منائی کی تصویروں اور آنے والے عہد کے فہار شوق و خار کاہل قسمت کے جلوں کو بھی نظر میں رکھنا ہوگا اور عالم کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے ان خطوط پر بھی غور کرنا پڑے گا، جن کے مطالعہ سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ کہیں شاعر عالم سے نثر نگار عالم زیادہ بڑا اور زیادہ اہم تو نہیں؟

عالم کے خطوط، ان کی شاعری، دیگر تصانیف اور حالات پر نظر ڈالیں تو ان

کی تخلیقی اور انسانی شخصیت کے کئی اوصاف سامنے آتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو مرقعہ رسوم و رواجیات کے منافی ہیں لیکن ان سے نئے تصورات و اخلاقیات

کا چہ چہا ہے، کچھ ایسی کہ جن کے لیے معاشرے کے تضادات یا شخصی اکتسابات نے وجہ جواز یا گنجائش پیدا کی ہے اور کچھ ایسی بھی کہ جنہیں محض ان کے دور کی برائیاں سے منسوب کر دینے سے ان کی تخریج نہیں ہوتی۔ ایک ممتاز خانوادے سے تعلق رکھنے والے غالب نے اپنے زمانے کے مروجہ علوم کس حد تک حاصل کیے، یہ امر بھی متنازعہ فیہ رہا ہے۔ پھر ان علوم میں انسانی فکر کو روشن کرنے یا عقیدہ رکھنے کے کیا سامان تھے، اس پر بھی بحث ہو سکتی ہے۔ اس زمانے کے مروجہ علوم میں تعلیم دین اور مطالعات زبان و ادبیات کے ساتھ مطلق اور فلسفہ، طب اور علم حیثت بھی شامل تھے۔ اکبر آباد میں غالب کی نظیر اکبر آبادی سے درس حاصل کرنے کی روایت بھی ملتی ہے۔ بالفرض یہ روایت صحیح نہ ہو اور غالب کے اعداد شاعری میں نظیر اکبر آبادی کے اثرات نہ ملیں، جب بھی کیا وہ اپنے شعر اور اپنے دور کی اس بڑی انسانی آواز سے بالکل غیر متعلق رہ سکتے ہیں، جب کہ دوسرے بھی، تاریخ ادب میں نظیر کی جدت اور کمال کو نظر انداز کرنے کی کوششوں کے باوجود کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ دہلی میں غالب کی ان کے شاعرانہ مرتبے کے مطابق تانے بانے محض چلتی تھی یا اس میں اس ذوقِ سخن کو بھی دخل تھا، جسے اُس دور کے تہذیبی زوال نے پروان چڑھایا تھا؟ لیکن اسی تہذیبی زوال کے درمیان شاہ ولی اللہ کی تحریک کے اثرات بھی موجود تھے، جن میں تقلیدی مسلمات اور چاند روایات کی مخالفت پائی جاتی تھی۔ جب دہلی ہی نہیں برصغیر کے طول و عرض میں دہشتناک شاہ ولی اللہ کے انکار گونج رہے ہوں تو کیا غالب کا بیدار ذہن ان سے بے نیاز رہ سکتا تھا؟ غالب نے اپنی راہیں ضرور تلاش کی ہیں لیکن اس میں ان کے زمانے کے غری اور تہذیبی ورثے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دہلی اس زمانے کے ملا و فضلا کا گھاؤ و بادبانی بھی بنی ہوئی تھی۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ غالب نے لکھنؤ اور کلکتے کے سفر سے کچھ نہ حاصل کیا ہو؟ وہ گرم کشا ہو کر چشم بھگ کو کھڑے نگارہ سے وا کرنے کے فائل تھے۔ مادی معرکہ آرائیوں اور ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں نے غالب کے ذہن پر جو نقوش مرتب کیے وہ بھی قابلِ غور ہیں۔ ادنیٰ معرکہ آرائیوں نے انہیں زبان،

عالم ... نظر اور نگاہ

لغت اور بیان کے اسرار و خواص کی جستجو پر مائل کیا تو ۱۸۵۷ء نے انہیں نئی سچکھش میں ڈالا۔ غالب کے انگریزوں کی تعریف میں متحدہ قصائد اور کچھ قطعات موجود ہیں۔ کالوں اور گوردوں دونوں کے مارے جانے سے رنجیدہ ہونے والے غالب جہاں دجنید میں انگریزی سلطنت کی حمایت کرتے ہیں، وہاں بین السطور کچھ اشارے بھی کر جاتے ہیں۔ اپنے خطوط میں غالب نے بار بار ۱۸۵۷ء کے بعد کی دہشت، مایوسی اور برداوی کا ذکر کیا ہے۔ جہاں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ”یہ شہر اب شہر نہیں قبر ہے“ اور ”ترجم یہ ہے تو تعاقب کیا قبر ہوگا“ وہاں کہیں یہ واضح اعتراف بھی کیا ہے کہ ”مفضل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔“ اس کے باوجود ان خطوط سے واضح طور پر اس انتہائی لمبے کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ خطوط جہاں غالب کی انسان دوستی کو پیش کرتے ہیں، وہاں بعض جگہ جاگیردارانہ سماج کے پیدا کردہ چند لازمی ناقصات کا آئینہ بھی ہیں۔ اپنے خطوط، زندگی اور دیگر تصانیف میں نہایت کے غالب نے اپنے بعض عقائد کا اظہار کرتے ہوئے بھی ایسی آزاد روی کا رجحان دیا ہے جو محض بیان کی حد تک نہیں اور اس سے نفی اور اثبات کی نئی راہیں نکلتی ہیں۔ اس سے ایک بات ضرور سامنے آتی ہے کہ اگرچہ غالب کے نزدیک زندگی اور فن مروجہ اقدار سے زیادہ اہم تھے، لیکن ان دونوں پر بھی سارے شخصی اور عصری تضادات کے باوجود بالادست احساس انسانیہ کی گرفت تھی۔ غالب کے حراج کی اشرافیت پسندی اور نظیر اکبر آبادی کی جہود دوستی، بظاہر دو الگ الگ شر معلوم ہوتے ہیں لیکن غالب کی استطاعت نہ رکھتے ہوئے بھی ایک عالم کا میزبان بن جانے کی آرزو، نظیر کی آدمیت سرائی ہی کی متوازی ذہن ہے۔

غالب کی شخصیت میں اپنے دور کی سچکھش اور خواہوں سے چمکتوں کے تضاد نے جو جھپٹکی پیدا کی ہے، وہ شادین اور فداوان غالب کے لیے بھی مشکلات کا باعث بنتی رہی ہے۔ حالی سے لے کر اب تک جب بھی کسی نے سادہ یا چاند مٹروٹے کے ذریعہ غالب کو سمجھنا چاہا ہے، تو اس کے ہاتھ ہوا میں گرہ باعد سے رو گئے ہیں۔ حالی

نے غالب کو حیدر علی عظیم کہا لیکن غالب کی عظمت تو ذات اور ماورائے ذات کے تصادمات کو پیش کرنے کا انداز نظر ہے۔ پھر بعض نے رجاہیت یا رومانیہ، قومی احساس یا افراط پسندی، وحدت الوجودیت یا مادیت، حزبیت یا فطرت آئینی، تصور پرستی یا واقعہ نگاری، غرض یہ ہے کہ متعدد فلسفیانہ دایرے اور ذہنی مفروضے غالب پر چسپاں کرنا چاہے ہیں اور ناکام رہے ہیں۔ جدید نفسیات کے عام ہوتے ہی بعض نے نئی چوڑی بھری ہے اور احساس کمتری سے لے کر زمکیت یا انانیت تک ساری الجھنیں غالب اور کلام غالب میں تلاش کر لی گئی ہیں۔ بعض نے ان کے ”انداز جنوں“ کو توہینِ حسن اور بعض نے مرضِ غودمانی قرار دیا ہے۔ غالب کو اس کے معاشرتی حالات میں دریافت کرنے کی کوشش مفید ضرور ثابت ہوئی ہے لیکن کافی نہیں کیوں کہ شخصیت ہو یا تاریخ ان کے بنانے میں متعدد عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور معاشرتی حالات نہایت اہم ہوتے ہوئے بھی تجربے کی تنہا بنیاد نہیں بن سکتے۔ پھر شخصیت اور تاریخ کے ایک دوسرے میں اثر و نفوذ کا پتہ چلانے کے لیے سلسلہ واقعات اور پوسٹ تفکیرات کے بہت سے منازل و مدارج سے گزرنا پڑتا ہے۔ غالب کے بارے میں ایک دوسرے رویے کا مطالعہ کریں تو الفاظ، تراکیب، انداز بیان، محاکات، علامات، پیکر تراشی اور صورت گری کا جائزہ دینا محکمِ غالب میں اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جس طرح شخصیت محض حالات و کوائف کے مجموعے کا نام نہیں، اسی طرح کلام کی معنویت کا دائرہ اجزا کی چھان بین سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ غالب کے دقیق اشعار کی مشکلات اپنی جگہ لیکن ان کے بعد کے نہایت آسان کلام میں جو سادگی اور سلاست کا انداز آیا ہے وہ دل قریب تو ہے لیکن نظر قریب بھی ہے۔ یہاں متعارفات اور متنازعات نئی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ان میں بچے و بچے خیالات نے محسوسات کی مختلف سطحوں کا روپ اختیار کر لیا ہے اور اس لیے ان کے نہایت سادہ اشعار بھی معنوں کی مختلف جہیں رکھتے ہیں۔ لیکن ان تہوں تک رسائی کے لیے ایسی شعری جہیم یا متن بھی ضرور ملتا ہے جو رو نہائی کر سکے وہ نہ وہ کی کوڑی لانے والوں کی کل بھی کئی دھمی اور آج تریخ کو تاج محل

سمجھنے اور سمجھانے والے جلالیادان خیل کی تعداد اور بڑھ چکی ہے۔ ان کے لیے ٹھکس متن ضروری نہیں کہ اس کا ہر نقطہ ان کی مرضی کے مطابق سوچ ہے یا تحت المعنی۔ غالب کی شاعری کا ”طلسم بیچ و تاب“ جس میں ان کے جوہر اندیشہ کی گرمی اور لفظوں کے سمجھنے ہائے معنی دونوں شامل ہیں، ایسے سرآمدان زبان کے لیے باصفا سرزنش بن گیا ہے جو شاعرانہ شخصیت اور شعری متن سے الگ محض قادی کے ذریعے منہم کی تحویل چاہتے ہیں۔ غالب خود فروشی کو جائے خندہ سمجھتے لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر حناغ غن کے ساتھ خود تک جانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جہاں وہ ”دیدہ تا دل اسد آئینہ یک پر تو شوق“ اور ”غفلت معنی سے خط ساغر راتم سرشار“ کہتے ہیں، وہاں ذوق آشتیادان غالب کو یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ:

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد

پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

غالب کی شاعری میں دود و آتش ہوں یا آئینہ و دل محض لسانی نشانات نہیں، بلکہ ان کے ذہن کے درجے سے نظر آنے والے زمین و آسمان کے وہ جلیل و جمیل اشارات ہیں، جن میں شاعر کے صعود و پرواز اور دروں بینی و فردو آمدگی کے نقوش ملتے ہیں۔ غالب کی محسوس کردہ سچائیوں میں جمیدان و طاقت کے اجزا سموئے ہوئے ہیں لیکن ان کے درمیان دل نوازی کا عنصر بھی ملتا ہے اور ایک نئی شعری جمالیات بھی۔ جسے جاننے کے لیے لسانی خوردہ بینی کی بجائے تہذیبی کلیت میں غالب کے شعور اور تحقیقی سزگی رفتار و جہت کا اعجاز ضروری ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار میں مین بیان کی دل آویزی جو احساس جمال کے روحانی نکاحوں پر پوری اترتی ہے، یوں ظاہر ہوتی ہے۔

دل سے تری نکاح بگر تک اتر چکی

دوہوں کو اک اوا میں رضامند کر چکی

دیکھو تو دل فرسج انداز عقل پا

سوچ خرام پار بھی کیا لعل کسر چکی

نگار نے بھی کام کیا وہاں غائب کا  
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

والٹ ویٹ مین (Walt Whitman) نے ۱۸۷۱ء میں ”جمہوری سلسلہ  
نظر“ (Democratic Vistas) میں کہا تھا کہ ”اگرچہ ادب کی آفاقی اور باقی رہ  
جانے والی خصوصیات دن اور موسم سے بے نیاز ہیں لیکن اُن کا جذبہ تخلیق اور جولان  
خون ہمیشہ اُن مادی اور سماجی حالات سے آتا چاہے جن میں اس کی تخلیق ہوتی ہے۔“  
وہ یہ اضافہ بھی کرتا ہے کہ ادبی روح (یعنی ادیب) لوگوں کے حالات اور تاریخ کی  
تفکیر کرتی ہے اور اسی سے ادب قوم کی روح بن جاتا ہے۔ عالم نے اپنے زمانے  
کے ذہنی موسم اور مادی حالات کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

کہیں حقیقت جاں کاہی مرض لکھے  
کہیں مصیبت ناسازی دوا کہے  
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے  
کئے زبان تو غنجر کو مرجھا کہے  
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے  
طراوت چمن و خوبی ہوا کہے

عالم کے لیے ذرا ذرا سا سفر سے خاتہ نیرنگ رہا ہے۔ اُن کی شعری  
بہاویات نچلے مستقیم کو راستی کی علامت نہیں سمجھتی۔ وہ اجڑائے بہار کو ربط یک شیرازہ  
وحشت قرار دیتے ہوئے، ایک عبودی موز پر اقدار کے تصادم کی ترجمانی کرتے ہیں۔  
لیکن اس تصادم میں حواس کی فعالیت بھی ایک مثبت قدر بن کر ابھرتی ہے اور عالم  
نے خود کائنات کے بارے میں حواس کے واسطے سے سوال اٹھائے ہیں۔ جب فن محض  
روحانی اور اسی اور اپنی فکر کی آواز کے تصور سے اوپر اٹھتا ہے تو انسان اور کائنات  
میں نئی ماسمجیں قائم کرنے کے لیے حواس اور خیال دونوں سے کام لیتا ہے۔ عالم  
نے ان دونوں کو پیش کرتے ہوئے وصلے ہوئے یا ترشے ہوئے اعتبار کے حدود سے

غالب... نگر اور نگار

قدم باہر نکالا ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک حسن، محض ایک طرز برائے عکس برداری نہیں بلکہ شور انگیزیِ حیات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کمال حسن اگر موقوف اندازِ تحافل ہے

تکلف برطرف تھ سے تری تصویر بہتر ہے

غالب کی شاعری کبھی غیر مصطل شدہ اسلوب، کبھی غیر ردائی تعلیلات اور کبھی غیر مانوس رسائلِ اتمہار سے حیرانی اور دعت کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ لیکن یہ اس لیے کہ حقیقت کی تفکیک روزمرہ سے زیادہ عظیم الجثہ انداز میں کی گئی ہے اور اس حقیقت کو پیش کرنے والی شخصیت کے متعدد اوصاف ظاہر کی واقعیت میں نمایاں ہونے سے زیادہ باطن کی خواب آفرینی میں صرف ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت اور خواب کے اسی تعلق سے غالب کے یہاں وجود کی تہائی، تڑوہ، تکلیک اور احتجاج کے محاسن بھی معاشرے کی مخالف طاقت بننے کی بجائے، انسانیت کی نئی گہرائیوں کو پیش کرتے ہیں۔ غالب کے اشعار، آسودہ خاطری سے زیادہ غلام و بیجان سے آشنا کرتے ہیں اور اسی لیے بعض اوقات ان کے بارے میں ناپسندیدگی کا فطری ردِ عمل کچھ زیادہ قہج انگیز نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ عام ذہنوں کو سکون پسند خاطر رہا ہے۔ البتہ آج جب غالب ہماری ادبی روایت کا حصہ بن چکے ہیں، اپنی غیر پسندیدگی کو اجزا کی ستائش کے پردے میں چھپانے کی کوشش عدم دیانت و ادنیٰ کا ذہنی کرتب ہے۔ غالب کی شاعری کے نئے پہلو ضرور دریافت کیے جاتے رہیں گے۔ لیکن ان کے لیے شاعر غالب کو کفن پہنانا، اور انسان غالب کو باہر نکال دینا ضروری نہ ہوگا۔

جمہوری معاشرے میں علم و دانش کے فروغ کے ساتھ غالب کی شاعری و شخصیت کے نئے گوشے اور شاعرانہ متن کے نئے معنی سامنے آئیں گے لیکن اس لیے کہ اس متن کے پیچھے غالب جیسا ہار یک میں اور دعت خواہ ذہن کا فرما ہے۔ آج کے بعض مذاہن غالب تو تحریف نگارانِ غالب سے بھی کم غالب خیال ہیں، جو کم از کم لفظ و معنی کی مکلف کا جلوہ دکھا دیتے تھے۔ آج شاعری کو نفسی تعلیلات سے عہدہ



کھنکھنے والے یا عبارات پیشیں میں ہر تحریری صورت کا سراغ لگانے کے خواہاں، زمانے کے تحریک اور شخصیت کی قوت و دلوں کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہی لسانی تفکیرات، خیال انگیز اور احساس خیز ہوتی ہیں جو زبان کے حدود سے گزر کر مساعد و نامساعد حالات میں انسانی کرب و تمنا کا تاثر چکاتا جاتی ہیں۔ غالب نے زندگی کی اس قوت کو پہچانا ہے جو زبان کو احساس کی لرزش اور خیال کا اشارہ بناتی ہے۔ معاشرے کے جمہوری تصور میں غالب کی شاعری زندہ تہذیبی تحریک اور تشویش کنندہ غایات کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ یہ فرد کی رنگارنگی اور انسانی فطرت کی پیچیدگی کو پیش کرتی، تسلیم قیود کے خلاف احتجاج و مزاحمت کی آواز اضماعی اور خیال کے خوف سے لرزنے والوں کو اُس کے حسن و عاقبت کے جلوے دکھاتی ہے۔ غالب نے انفرادی کیفیات کو نام دیے اور انہیں عالم آشنا بنایا ہے۔ اپنے سارے تضادات کے باوصف بلکہ ان کے پیدا کردہ اضطراب سے، ان کی شاعری افس و آفاق کو ربط دینے کی وہ غلاقانہ کاوش ہے کہ جس کے ذریعے صحرا و سنگاویں ہیں۔ ان کے لیے دل خود سراغ درد بن جاتا ہے اور وہ آئینہ عرض کو خط و خال بیاں نہ پوچھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ غالب بنائے عہد و قحط کو تعمیر کائنات سے بڑا درجہ دیتے ہوئے وہ انتخاب انگیز شعر کہتے ہیں کہ جو حافظ کے بنائے محبت کو خالی از غلط کہنے کے مقابلے میں انسانی ترجیحات کو زیادہ نمایاں کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اے چرخ خاک بر سر تعمیر کائنات  
لیکن بنائے عہد وفا استوار تر



## غالب: نظر اور منظر

ہر بڑا شاعر اپنی یوٹیکا ساتھ لاتا ہے۔ لیکن یہ یوٹیکا ذات سے تعلق رکھتے ہوئے صرف ذات تک محدود نہ رہ کر، نئے علاقے دریافت کرتی، سماجی اور فنی شعور کی روشنی میں آگے بڑھتی روایات سے تقویت پاتی، جذبات اور تصورات کی منزلوں سے گزرتی، اظہار کے فنی سانچے و محاسن اور آخر کار حال و مستقبل کا ایسا نقش منظم کرتی ہے، جس سے ادبی ملبوم ہی میں نہیں، زندگی کی معنویت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

غالب کی شاعرانہ بڑائی خود اپنی اور زمانے کی قائم کردہ سرحدوں کو توڑ کر آگے نکل جانے میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شخصی اظہار سے غیر شخصی بیان کے بیکر تراشتے، اپنے دور کی ترجمانی کرتے ہوئے، آنے والے ادوار کی خبر دیتے اور عصری مظاہر کے ذریعے آفاقی عناصر کو نمایاں کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری کا بیج و تاب بعد کی نسلوں کا حوالہ بھی بنتا رہا ہے اور اس نے روایات ماضی سے گھرے، تعلق کے باوجود نئی تہذیبی منزلوں کا سراغ بھی دیا ہے۔ ان کی شاعرانہ فکر جو تمام اجزا کو ایک منضبط سلسلے میں سمیٹ لینے کی فلسفیانہ فکر سے مختلف ہے، کثرت آرائی مظاہر کے اتحاد و تضاد کا نظارہ کرتی اور ایک نئی وحدت کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کی سوجھ بوجھ میں، خود بھی عمومی سچائیوں کی جستجو میں منہمک رہتی ہے۔ لیکن اس شاعرانہ جستجو

کے نتائج، ایک دوسرے سے دست و گریباں قوتوں کی ایسی بڑی صداقت کا انکشاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو تاریخِ انسانی کی ترقی کی راہیں ہموار کرتی رہی ہے۔ ان کے خیالی پیکر ایسے اصنامِ خیالی بن جاتے ہیں، جن کی مماثلتوں اور مغائرتوں سے زندگی کی رنگارنگی کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ اسی رنگارنگی کے وسیع اور موثر اظہار کے لیے شخصی تخلیقی قوت کے ساتھ جس تہذیبی جامعیت، داخلی احساس اور خارجی اوراک کی ضرورت ہوتی ہے، وہ صرف یکاۓ روزگار افراد کا حصہ ہے۔ غالبؔؔؔ ایسے ہی یکاۓ روزگار تھے، جن سے انسانی زندگی کے وہ نقوش روشن ہوئے، جن میں آج اور کل کے ساتھ ساتھ غیر محدود زمانوں کی تابش ملتی ہے۔

غالبؔؔؔ کا زمانہ سماجی انحطاط کا زمانہ تھا۔ اس میں نئے دور کا سراغ بھی مل رہا تھا۔ البتہ قدامت اور جدت کی کجکوش ہر آئینہ خیال کو جلا نہیں دے رہی تھی۔ اگرچہ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ غالبؔؔؔ کا عہد تخلیقی سرگرمیوں اور فنی ریاضتوں کا عہد ہے۔ جن کے کئی مہینیتوں سے اچھے اور اہم نمونے بھی مل رہے تھے۔ مگر یہ سرگرمیاں اور یہ ریاضتیں زندگی کی پوچھوٹیوں کے شاعرانہ اوراک کے بجائے ایک محدود صورت سے تعلق رکھتے ہوئے قدرتِ بیان کے نمونے پیش کر رہی اور مضمونِ آرائی و نزاکتِ خیال کو مستحکم بیان کے سانچے میں ڈھال رہی تھیں۔ غالبؔؔؔ بھی اپنے دور کے نگاروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، لیکن ان کے یہاں مضمونِ تازہ، شاعرانہ فکر کی تازہ کاری بن جاتا ہے اور ان کی فکر روشن ترقی و کشف کے مادی اور ذہنی مظاہر کو صرف شاعرانہ شاہجوں اور تشابہوں میں پیش نہیں کرتی، خود ان کی ذات میں تضاد کے تصادم سے نمونہ پا کر ایسی خیالی رو دوڑاتی ہے کہ شاعرانہ پیکر دھڑکتی ہوئی زندگی سے معمور نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ فکر میں جہاں صدیوں کے کرب و امید کا احاطہ کرنے والی دانش کا پرتو لگا ہے، وہاں وہ انسانی مطلق کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں، جو اپنے ارتقاۓ نظر میں تمام معاصرین سے الگ ہے۔ غالبؔؔؔ کے انکشافِ ضم نے انھیں جو ہونے غزلِ سرائی اور مجلسِ لسانہ خوالی بخشی ہے، وہ محض ذات اور عہد کی داستان نہیں رہتی۔ وہ جہاں خوابِ منھنکو

غالب۔۔ نظر اور نگارہ

ہر دل و جاں کی میزبانی کی خواہش کرتے ہیں، وہاں اس سنگھٹو میں ایسے پیرائے بھی نظر آتے ہیں جو لکچر تاریخ کو اپنی مٹھی میں لپیٹے ہوئے اور اپنے زمانے کی صداقتوں کی گرفت کرتے ہوئے نئے زمانوں کی خبر دیتے ہیں۔ اس میں غالب کے ذہن کی وہ رو بھی شامل ہے جو جدید ذہنوں میں انہیں مقبول بناتی ہے اور وہ نظر بھی جو تقلیدی روایات کے منجمد سانچوں کو توڑ کر نئی ثقافتی منزلوں کی جستجو کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر وہ آزاد مشربی بھی جو انسانی دروندی اور درویشائی کے نئے معیار بھاتی ہے۔ لیکن غالب کے کمالات فن نے جو راستے طے کیے اور جن صورتوں میں نمایاں ہوئے ہیں، ان کا تجزیہ بھی ”لباسِ نظم میں بالیدین مضمونِ عالی“ تک رسائی کے لیے ضروری نظر آتا ہے۔

چاگیر دارانہ معاشرے کے قائم کردہ معیارات اور اندرونی تضادات کے ساتھ غالب کے عہد میں، تصوف کی روایات جو اردو، فارسی اور ترکی شاعری میں بڑی جان دار قوت رہی ہیں، شاعرانہ سوچ کے خطوط متعین کر رہی تھیں۔ دراصل کسی ملک کے ادب کو اس کی تہذیبی روایات سے منقطع نہیں کیا جاسکتا۔ ان روایات میں ذہنی قبولوں کی متعدد صورتیں ملتی ہیں۔ ان کے رد و قبول دونوں سے ذہنی قبولوں کے فکری گوشے اور درجہ واضح ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی ملک یا خطے کے ادب کو اس ملک یا خطے کے ذہنی تصورات اور روایات کے تہذیبی پس منظر میں دیکھا جائے تو مشرق ہی نہیں، مغرب کے فلسفیوں اور شاعروں کی تفہیم بھی آسان ہو جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں مصوفانہ خیالات نے جو اہم حصہ لیا ہے ان کو (شیخ علی حسین کے قول کے مطابق) ”برائے شعر گفتن خوب است“ کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا اور نہ ان کی موجودگی سے غالب کو صوفی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شک اور یقین کے درمیان کا پردخ بھی نہیں، اگرچہ اس نوع کے اشعار بھی غالب کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ صدیوں کے صوفیانہ خیالات نے جن تہذیبی اقدار کی نشوونما کی تھی، ان میں مابعد الطبیعیاتی وحدت کی جانب رجحان، اختلافات کے درمیان دوستی، اتحاد، ترکیب رسوم کا میلان، عیسائی کاروں کے لیے حرف

تسل، ہاتھ کی صفائی پھڑور، نگاہِ باری کی خدمت، راسخی اور گرم نگہ کی راہوں میں کم فاصلگی، کشادہ ذہنی اور احرامِ انسانیہ کے بڑے عناصر شامل تھے۔ اس کے ساتھ ہی کششِ حسن بھی جذباتی اور تصوراتی دونوں صورتوں میں بڑی شدت سے نمایاں ہوئی تھی۔ غالب کے ذہن نے اس تہذیبی منظر کو جذب کیا۔ ان کے متعدد اشعار کا مطالعہ سرمایہٴ تصوف ہی کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کا ذہن ان تصورات کا مروجہ رسوم و معہدات سے تصادم کا نگارہ ہی نہیں کر رہا تھا کہ ہم آسانی سے اسے طریقت کا سخت گیرئی عقائد سے اندازہ ستیز کہہ دیں بلکہ خود ہونے اور نہ ہونے کی چٹختش میں (”ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب۔ آخر تو کیا ہے اے ”نہیں ہے“) ہستی و عدم کے درمیان ہلکے عالم کے مجاہدے کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس لحاظ سے غالب کی شاعری میں استہدام اس تاثرِ کشش کا محض ایک نگاہی روپ ہے لیکن اس کشش کی شدت کا اندازہ کیفیاتی گیرائی اور طلبِ انسانی کی گہرائی سے ہوتا ہے، جس سے شاعرانہ تخیل میں قوت آئی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ:

کیوں نہ طوطی طبعیت تو بھرائی کرے  
ہاتھتا ہے رنگ گل آئینہ برچاکِ قص

☆

عالم جہاں بھڑ بھڑ بساطِ وجود تھا  
جوں سج، چاک جیب، مرا تار و پود تھا

☆

ہنوز عمری حسن کو ترستا ہوں  
کرے ہے ہر نہی مو کام چیم چٹا کا

☆

فریبِ صحتِ ایہاد کا تماشا دیکھ  
نگاہِ نگہش و خیال آئینہ سار

اہل بیتش نے پہ حیرت کدۂ شوئی تاز  
جوہر آئندہ کو طوطی بھل باغِ حما

☆

یہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار  
دیدہ گوخوں ہو تماشائے چمنِ مطلب تھا

☆

اسد ہے طبع مجبور تمنا آفرینی ہا  
نہاں ہے اختیاری و فریبِ آرزو خوردن

☆

حسن ہے پردا طریدارِ سراجِ جلوہ ہے  
آئندہ زانوئے کبرِ اختراعِ جلوہ ہے

☆

دہانے سے نچو آئندہ و رقیبِ نفس نہیں  
ہے کوچہ ہائے نے میں طہارِ صدا بلند

☆

لڑتا ہے مرا دل زحیمِ سرِ درخشاں ہے  
میں ہوں وہ قہرۂ شبنم کہ ہو غارِ بیاہاں ہے

☆

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سستی آزادی  
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصتِ روانی کی

☆

موتنی ہستی ہے عشقِ خانہ دہراں ساز سے  
انجمن بے شمع ہے گر برقِ غمخیز میں نہیں

☆

بلکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا  
آوی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند  
گستاخی فرشتہ ہماری بیتاب میں

☆

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے  
لوہج جہاں پہ حرفِ سحر نہیں ہوں میں

چنانچہ غالب کے متعدد اشعار میں تصوف کے خیالات بھی زندگی کی مادی صورتوں کی صورت گری اور انسانی صورت حال کی ترجمانی میں صرف ہوئے ہیں۔

غالب کی شاعری میں انسانی فکر کی حدیں جس طرح وسیع ہوئی ہیں، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ذات، ماحول اور کائنات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں بلکہ اہل فکر کو پابینِ رسم و روہ عام کا طعنہ بھی دیتے ہیں۔ ان کے لیے صوفیانہ تصورات، زندگی سے فرار کا ذریعہ، خود فراموشی کا وسیلہ یا رام تقلید کا سہارا نہیں بنے ہیں۔ وہ سوچ اور فکر کو مہینز کرتے ہیں اور تلاش و تحقیق کی جانب لے جاتے ہیں۔ ان کے واسطے سے ایک جانب انھوں نے انسانی اقدار کا اثبات کیا ہے اور دوسری جانب ان سے مدد لے کر وہ نئی روایات اور ذہنی مساوات کے نئے امکانات سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

دل گزرگاہِ خیال سے و ساغرِ ہی سہی  
کر گیس جاوے سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہے عشرت کی خواہش ساتی گردوں سے کیا کچے  
لے بیٹھا ہے اک دو چار جام واڑکوں وہ بھی

☆

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ سماں ہے  
برقِ عزمِ راحت خونِ گرم وہاں ہے

☆

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا  
مگر نہیں شمع یہ خانہ لیلیٰ نہ سہی

صوفیانہ تصورات کے روایاتی عناصر ان کی شاعری کا ایک رخ ہیں لیکن ان کی غیر روایاتی فکر، ان سے افکار کی نئی عظیم کا کام بھی لے رہی ہے۔ اس لحاظ سے دوسرا رخ وہ ہے جو اپنے دور کی تاریخ کو شاعرانہ ادراک کا جزو بناتے ہوئے مستقبل کے لئے تہذیبی نقوش ترسیم دے رہا ہے۔ وحدت و جدوی فکر، کیر اور دارالحکومہ کے یہاں بھی مل جاتی ہے لیکن اپنے تہذیبی اظہار میں وہ روی، عمار اور سنائی سے مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کی وحدت و جدوی فکر کا تہذیبی جائزہ لینے کے لیے ان کے مجموعی تہذیبی مزاج پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

غالب نے اپنا تہذیبی تعلق ایران اور وسط ایشیا سے قائم کرنا چاہا تھا۔ برصغیر کے قاری کو شعرا کے مقابلے میں وہ ایرانی شاعروں کو نظیر مانتے تھے۔ قاری شاعروں میں بطور خاص انھوں نے طالبِ آملی، عرفی شیرازی، نظیری اور ظہوری وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ بیدل ایک درمیانی راہ تھی جس سے وہ جلد گزر گئے۔ لیکن دلچسپ بات یہ کہ اس لحاظ سے ماضیِ قریب کے مقابلے میں ماضیِ بعید کو اپنا نشان بناتے ہوئے غالب نے مستقبل کی تہذیبی سمت کا تعین کیا ہے۔ ہم گیر انسانیت پر یقین رکھتے ہوئے بھی وہ اس جانب بڑھے ہیں جہاں تہذیبی امتیازات نمایاں ہوئے ہیں اور مستقبل کی تاریخ میں بتدریج اپنا اثر دکھاتے گئے ہیں۔ وہ سرسید کی مدون کردہ آئینہ اکبری کے بارے میں



رائے دیتے ہوئے جہاں انگریزوں کی لائی ہوئی صنعت اور سائنس کی تعریف کرتے،  
"مردہ پروردن مہارک کار نیست" کہتے اور یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ:

بخش ایس آئیں کہ دارد روزگار  
کشتہ آئین دگر تقویم پار

وہاں وہ شیعوہ تصوف کے مطابق اکثر مقامات پر کفر کی مدح تو کرتے،  
"کافر خوانی شد ناچار مسلمان شہ" کہتے ہیں، لیکن برہمن کو "وفاداری بشرط استواری"  
کے اصل ایمان ہونے کی حیثیت ہی سے کہے میں گاڑنے کا جواز پیدا کرتے اور یہ  
بھول جاتے ہیں کہ اس کی وفاداری کا تہذیبی آخر جلانے جانے میں ہے، گاڑے جانے  
میں نہیں۔ دراصل غالب وسیع انسانیت کی شاعرانہ فکر کو بخش کرتے ہوئے بھی اسے جن  
رنگوں میں نمایاں کر رہے تھے، وہ مسلم خطوں کی تہذیب کے پیدا کردہ رنگ تھے۔ ابھی  
ان رنگوں کی مستقبل میں نئی تشکیل کا وقت نہیں آیا تھا، لیکن غالب اپنی ذہنی ترجیحات  
سے انھوں مستقبل کا اشارہ بنا رہے تھے۔

ایٹ نے ادب کو شخصیت کا اظہار نہیں، شخصیت سے فرار قرار دیا ہے اور  
سارتر نے ادب کو ذاتی تصریحات کا سلسلہ بتایا ہے۔ شاید دونوں باتوں میں سہائی کی  
رضی موجود ہے، لیکن باری سہائی نہیں۔ حقیقت زندگی کی طرح بخش تر تعریفوں سے  
بالتر حیثیت رکھتی ہے۔ ادب اور شاعری میں لکھنے والا خیال کی متوازی دنیا تخلیق کرتا  
ہے، لیکن اس متوازی دنیا کا حقیقی دنیا سے گہرا تعلق ہے۔ ادیب کی اپنی شخصیت سے  
فرار کی راہیں بھی اس کی ذاتی شخصیت کے کوائف حصین کرتے ہیں جن سے الگ ہو کر  
وہ فرار کی راہیں بھی تلاش نہیں کر سکتا۔ مگر ادب کی متوازی دنیا حص ذاتی تصریحات تک  
محدود نہیں رہتی۔ اس میں اجتماعی تجربات سے لے کر آفاقی اور کائناتی صداقتیں بھی  
وصل جاتی ہیں۔ یہی نہیں اس کا تخیل مستقبل کی عقل آرائی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ غالب  
کی ادبی شخصیت، حص ان کی ذاتی شخصیت نہیں۔ غالب اپنے فن کے آئینے میں اپنے  
ذاتی کوائف سے محاذ ضرور ہیں، لیکن اس سے بالاتر حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ وہ اجتماعی

غالب۔ نظر اور تھارہ

بصیرت کا نکلنا دینے والے، حال کے ہنگاموں سے اثر پذیر اور سرگرم تخیل ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی لرزشوں کو محسوس کرنے والے بھی نظر آتے ہیں۔ غالب انسان کی نہ بدلنے والی خصوصیات کے شاعر، اس کی زندگی کو بدل دینے کی آرزو کے ترجمان، اپنے تہذیبی ورثے کے نگہدار، قائم شدہ تہذیبی اقدار کے ناقد، آنے والے دور کے پیش رو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فطرت اور کائنات سے انسان کی اس ہمیشہ جاری رہنے والی کشش کے امین بھی رہے ہیں، جس نے ہر دور میں جہان تازہ کی تخلیق کی ہے۔ یہ دور نہ خصوصیتیں غالب کی ادبی شخصیت کو بڑائی عطا کرتی ہیں۔ غالب اپنی ذات کی ساری کم زوریوں سے گزر کر بلکہ بعض اوقات ان کم زوریوں کے باعث تخیل کی ایک ایسی دنیا آباد کرتے ہیں، جہاں انسان کی مظلومی اور بڑائی دونوں کے نقوش ملتے ہیں۔ غالب کے فن میں کیفیتوں کا جو جہان معنی ہے، وہ صرف ان شاعروں کے یہاں ملتا ہے، جنہیں علامہ تابان روزگار کہا جاسکتا ہے۔ انہیں ملل تہذیب کا بہترین ترجمان کہا گیا ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو ”مندیپ گھمن نا آفریدہ“ کہہ کر جس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں، اس کی بھی بڑی حیثیت ہے۔ زندگی کے عاتقانات اور تعذبات سے ان کی دوج قامت ادبی شخصیت جو ٹیکر تراشتی ہے، انہیں انسانوں کی ذہنی زندگی کی ایسی متاع قرار دیا جاسکتا ہے، جو کم یاب اور نادر ہے۔ بخورتی نے غالب کے کلام کو دیکھ مقدس کی طرح الہامی قرار دیتے ہوئے غالب ہی کے خیال ”آن دین ما ایزدی کتاب میں ہوئے“ کی ترجمانی کی تھی۔ غالب کو اپنی بڑائی کا احساس تھا لیکن کیا وہ اس بڑائی کی جہتوں کا تعین کر سکے تھے یا اس کی تنہیم کا کام مستقبل کی سطحوں کے حوالے کر دیا تھا؟

غالب سے اردو شاعری میں جدید ذہن اور اردو نثر میں جدید طرز اظہار کی بنیادیں پڑی ہیں۔ ان کی شاعری کے کمال سے ان کی نثر نگاری کا حر حلال کم نہیں۔ لیکن دونوں میں جس ادبی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے، وہ اتنی متنوع اور رنگارنگ ہے کہ اس سے دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ غالب سے غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت ان کے بارے میں

وہ تصنیفات ہیں، جن کا سلسلہ دنیا کے کئی ملکوں میں جاری ہے۔ شاید غالب اور اقبال سے زیادہ اردو میں کسی اور لکھنے والے کے بارے میں اتنی کتابیں شائع نہیں ہوئی ہیں۔ خود اقبال نے غالب کو خراجِ حسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا  
ہے یہ مرغِ تحفیل کی رسائی تاکہا

اور

حیرے فرد وہی تحفیل سے ہے قدرت کی بہار  
حیرے کھجور سے اُگتے ہیں عالم ہزار

اقبال نے غالب کے خیال کی بلندی کو جس طرح سراہا ہے، اس سے دونوں کے کلام کی کچھ مشترک بنیادوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر نے ”ہانگ ورا“ کے دیباچے ہی میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔

غالب کے فکر و فن سے یہ دلچسپی صرف ان کے نادرہ کارِ تحفیل کے سبب سے نہیں۔ اس بات سے بھی ہے کہ ان کی شخصیت معنائی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی فکر ایک نچلے مستقیم میں نہیں بڑھتی بلکہ کئی قوس اور دائرے بناتی ہے۔ غالب کے کلام کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں اور ان کے فن پر مختلف زاویوں سے روشنی پڑی ہے، لیکن اب بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے رموزِ پوشیدہ رہ گئے ہیں اور کئی باتیں ایسی ہیں جن کا رد کیا جانا ضروری ہے۔

غالب دو دنیاؤں کے درمیان سانس لے رہے تھے۔ لیکن ان دنیاؤں کا ادراک ان کی ادبی شخصیت کی حاصل خیزی اور ان کے تصاویرات کا اعجاز ان کا مجرأ فخر ہے۔ ہم آج تکنیکی اور فکری سطحوں پر کیسے کیسے اٹھکات سے گزر رہے ہیں۔ لیکن ان اٹھکات نے غالب کی طرح اس سلسلے کو فروغ نہیں دیا کہ ”ایسا دانتوں میں جو جھکا ہوا ریڑھ نیساں کا۔“ غالب نے خود فن کی سطح پر جو سفر طے کیا ہے، اس کی ہر منزل میں بہت سے رہرو پھنس کر یا تھک کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن غالب اپنے ارتقا میں متعدد

غالب... نظر اور طائر

وہی منزلوں سے گزر رہے۔ اپنی شاعرانہ فکر کو نئے افقوں سے آشنا کرتے، حریف برائے ایک اور بلندی پر منظر بنانے کی تمنا رکھتے ہیں۔

غالب نے نہایت کم عمری میں اپنی ایک مثنوی میں چنگ باڑی کے طازمات سے دل کے سرخیز آزادی کا بیان سمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

دل نے سن کر کاپ کر کھا بیچ و تاب

خوٹے میں چاکر دیا کٹ کر خواب

اور اس سے رشتہ گردن کا پتہ دیا ہے۔ غالب اس منزل پر وہ جاتے تو کیا غالب بن سکتے تھے۔ لیکن وہ ایسے دور از کار طازمات کو جو دوسروں کے لیے استادانہ پند کاری کی دلیل تھے، ترک کر دیتے ہیں۔ لیکن شاعری، لفظی مناسبات سے جو فائدہ اٹھاتی ہے، غالب اس سے کام لیتے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ قابل توجہ ان کی تفسیر بیدل کی منزل ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ:

اسد ہر چاخن نے طرح بارغ تازہ ڈالی ہے

مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

بیدل کی بڑائی اپنی جگہ لیکن کیا غالب کی ”رنگ بہار ایجادی بیدل“ انھیں غالب بنا سکتی تھی؟

مجھوں جیسے اہم نقاد نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالب کا ”وہ کلام بھی توازن اور خوش آہنگی کے ساتھ بیدل کے آہنگ سے متاثر ہے جو ان کی پختگی اور رسیدگی کے دور کی تخلیق ہے۔“ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام میں بیدل کا اثر کم سے کم ہوتا گیا۔ قاری میں انھوں نے بیدل کی بجائے ایرانی نژاد شعرائے قاری کو اپنا نمونہ بنایا اور اردو میں مزاج اردو سے آشنائی کے علاوہ ان کے مزاج کے وہ جوہر نکلتے گئے جو علاحدہ و منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب تفسیر بیدل کی منزل سے جلد ہی گزر گئے۔

بھی نہیں جہاں وہ قاری گویاں ہند سے اپنی برکت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہاں وہ نام لے کر بیدل کو بھی نکال دیتے ہوتے کہتے ہیں کہ ”نا سمر علی اور بیدل اور نصیرت

ان کی قاری کیا؟ ہر ایک کا کلام بنکر انصاف دیکھیے ہاتھ کلن کو آری کیا۔“ اس سلسلے میں وہ ایک خط میں مزید لکھتے ہیں کہ ”ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔“ وہ رووٹی و فرووٹی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری و غیرہ تک تھوڑے بہت تفاوت سے ایک گردہ قرار دیتے ہیں۔ حضرت سعدی کو طرز خاص کا موجد بتاتے ہیں اور فغانی کو ایک اور شیوہ خاص کا مبدع ٹھہراتے ہیں جس میں خیال ہائے نازک اور معانی بلند پائے جاتے تھے۔ ان کے خیال میں اس شیوے کی تکمیل غمہوری و نظیری، مرقی و فوقی نے کی۔ ان سے بھول غالب قلب سخن میں جان پڑ گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس روش کو اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چہرہ دیا۔ صاحب و کلیم و سلیم و قدوسی و حکیم شطائی اس زمرے میں ہیں۔ بھول غالب ”رووٹی و اسدی و فرووٹی کا شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی طرز نے یہ سب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔“ غالب کے خیال کے مطابق ”فغانی کا اعزاز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے“ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ خیال ہائے نازک اور معانی بلند کے لیے وہ بیدل کو نہیں فغانی کو شیوہ خاص کا مبدع بتاتے ہیں۔ وہ قاری طرزوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”تو اب طرز میں تین ٹھہری ہیں۔ خاقانی اور اس کے اقران، غمہوری اور اس کے امثال، صائب اور اس کے نظائر۔“ غالب کے خیال میں جن قاری گو شعرائے ہند کا کلام ان طرزوں میں نہیں وہ اچھی طرز ہو تو ہو ”مگر قاری نہیں ہے۔ ہندی ہے، داراغریب شای کا سک نہیں ہے، نکسال باہر ہے۔“ وہ میرزا رحیم بیگ کو لکھتے ہیں کہ ”اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب میرا بھی مولد ہندوستان ہے، میری طرف سے جواب یہ ہے کہ ہند ہندی مولد و پارسی زبان ہے۔“ یہ سارا قصہ جو ادبی تاریخ کا حصہ ہے، اب شاید بے موقع نظر آئے لیکن اس کے دہرانے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے غالب کے تہذیبی مزاج اور رخ کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ غالب کو اپنی قاری دانی کے ساتھ ساتھ ترکی انسل ہونے پر بھی غر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانے میں عربی کی دینی حیثیت کے ساتھ فارسی عالمِ اسلام کی تہذیبی زبان بن گئی تھی۔ یہاں تک کہ سلاطینِ ترکی بھی فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ترکی علاقوں میں ترکی اور برصغیر میں اردو نے فروغ پایا۔ حال کے کچھ نقاضوں کے تحت غالب ماضی کو اہمیت دے رہے تھے۔ حقیقت کو افسانے سے آمیز کرتے ہوئے غالب نے دعویٰ کیا تھا کہ:

ساقی چو من پشگل و افراسیابم

دانی کہ اصل گوہم از دودۂ جم است

یعنی وہ "از خاک پاک تو را شیم" کے فقرے کے ساتھ میراثِ ایران کے دعوے دار بھی بن رہے تھے۔ سبک کی تعریف لغاتِ فارسی میں "روش و طریقہ در ادبیات و ہنر" کے طور پر کی گئی ہے اور سبک ہندی کی "تجلیاتِ غیر لطیف و مخصوص بہ ذوق ہندیوں" کہہ کر تنقید روا رکھی گئی ہے۔ لیکن اس سبک کی خیال بانی اور وقت مضامین اس برصغیر سے مخصوص نہیں تھے۔ اس کو سبکِ اصفہانی یا شیوہ خاص خیال ہائے نازک و بلند کے نام سے ایران سے منسوب کیا گیا ہے۔ غالب شعرائے ایران کی ہم دی کا دم بھرتے اور شعرائے ایران سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے۔ چنانچہ بیدل کو جو سبک ہندی کے بڑے شاعر تھے انھوں نے غیر مستحکم قرار دے دیا۔ اپنی ذاتی تربیت کے سلسلے میں کہا کہ اول اول وہ ان لوگوں کی پیروی کرتے رہے جو راجہ صواب سے تاملتے تھے "تا اینکه شیخ علی حسینی نے مسکرا کر میری بے رادہ روی مجھ کو چٹکائی، طالبِ آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ میں تھا، اس کو فنا کر دیا۔ غصہ و ہمتی نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تھوپے اور میری کمر پر زانو مارا۔ بعد ازاں نظیری نے خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گرد و والا شکوہ کی تربیت سے میرا کلکِ راقم حال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار۔" غالب شعرائے ایران کی تعریف کرتے اور کہتے ہیں کہ "میں اہلِ زبان کا بیرو ہوں اور ہندویں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما اور متاخرین میں مثلِ صاحب و

کلم و اسیر و حزیں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا۔“ علی حزیں نے ابو الفضل اور فیضی کے بارے میں کہا تھا کہ ”دردِ اغانی ہند ازیں دو برابر بہتر ترے نہ خاست۔“ غالب فیضی کے بارے میں کہتے ہیں کہ ”غیر فیضی بھی غنّز کوئی میں مشہور ہے۔ کلام اس کا پسندیدہ جمہور ہے۔“ لیکن ان کے خیال میں درجہٴ استاد اسے بھی نہیں اور اس ”غیر“ کی رعایت بھی وہ دوسرے قاری گو شعرائے ہند کو دینے کے لیے تیار نہیں۔ اگرچہ قاری گو شعرائے ہند اور برصغیر میں قیام کرنے والے ایرانی شعرائے فارس کے درمیان نزاع موجود رہی تھی لیکن یہ ایک ایسی تہذیبی نزاع تھی جس کی معاشی و معاشرتی بنیادیں بھی تھیں۔ لیکن اس کی بنیاد غالب اور ہم نوایانِ قیصل کے تنازع سے مختلف تھی۔ اس وقت اس تنازع کی معاشی اور معاشرتی بنیادیں زیادہ اہم رہی تھیں۔ غالب ہندی مولد تھے اور برتری کا دھوئی ان کے تہذیبی مزاج کی آئینہ داری کر رہا تھا۔ وہ اپنی قاری شاعری کی منہائے کمال شعرائے ایران کی جڑی سمجھتے تھے۔ کہیں کہیں ان ہی کے قائم کردہ رنگ میں وہ بہ طورِ تھلی سہنت کے دھوے دار بھی ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے راستوں سے الگ ہٹا انھیں گوارا نہیں تھا۔ کیا حقیقتاً ان کی منزل صرف جڑی شعرائے ایران ہی تھی اور کیا یہ جڑی انھیں بدعاً ماضی قرار نہیں دیتی تھی؟ ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو کیا غالب وہ غالب ہوتے جنھیں ہم آج یاد کر رہے ہیں۔ ہند کے قاری گو شعرا نے شعرائے ایران پر جو اعتراضات کیے ہوں اور ایرانی شاعروں نے ہند کے قاری گو شاعروں کو جس طرح کم و قدر سمجھا ہو، اس کے معاشی اور طبقاتی اسباب غالب کے زمانے میں باقی نہیں رہے تھے۔ دہلی سے چٹک ”بگذر از مجموعہٴ اردو کہ بے رنگ من است“ کہنے کا باعث تو بن سکتی ہے لیکن غالب کے مجموعی تہذیبی مزاج کی ترجمانی نہیں کرتی۔ یہ ایک ایسے تہذیبی شعور کا مسئلہ تھا جو اپنے وقت کے معیارات کو ناکافی پاتا تھا۔ قاری کے لیے شعرائے ایران کی سند اور اردو کے لیے محاورہ ہندی بھی اس مسئلے کا جواب نہیں تھے۔ ایک جڑی تہذیبی عنصر کے دخول نے برصغیر میں تہذیبی ترقی و تبدیلی کی رفتار، تہذیبی شخصیات اور ترکیب پذیری کے

غالب۔ نظر اور طائرہ

عمل کو چیز کر دیا تھا۔ اردو زبان جو پہلے ہی تاریخی طور پر سنی سرچشموں سے فیض یاب تھی اب ایک نئے اور بڑے تہذیبی سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ اردو زبان، عربی، فارسی اور ترکی کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی ایک بڑی زبان بنی جا رہی تھی۔ فارسی کی شیعہ طرازی اور سحر بیانی اب نئے حالات میں اردو کے قالب میں ڈھل کر نئے ذہنی تقاضوں کو آسودہ کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اردو خود ایک ایسی زبان بن رہی تھی جو اپنی آزادانہ حیثیت رکھتی تھی (کہتے ہیں اسے زبان اردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا۔ داس) دونوں رجحانات کے آثار پہلے سے موجود تھے اور غالب کے یہاں دونوں الگ الگ اور منحوج بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو کے اس تہذیبی روپ کا جو بعد کی تحریروں میں شفا ایک جانب ایوانکلام آزاد اور اقبال کے ہاں اور دوسری جانب سرسید، حالی آزاد اور اکبر کی تحریروں میں نمایاں ہوا، پہلا نشان لہا غالب ہی تھے۔

غالب کو فارسی کے دس اور جس سے فائدہ پہنچا۔ پہلے انھوں نے اردو ہی میں شعر کہے۔ پھر اردو شاعری کا سلسلہ فارسی شاعری کے ساتھ چلا رہا۔ ان کی اردو نثر کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ غالب کا فارسی کلام بھی ان کے ذہن کی طرازی اور فکر کی وسعت کا حامل ہے۔ کیوں کہ یہ بھی اس ادبی شخصیت کا کرشمہ ہے جو ”سمیہ می پرم راہ گرچہ پانہخت“ کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ ان کی شخصیت میں بت فکری، خلعتی رسوم اور ذہنی قوت کے جو عناصر تھے وہ ان کی فارسی شاعری میں بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ ان کا مشہور شعر ہے کہ:

ہاں میاویز اسے پدر فرزند آذر را نگر

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں غافل نگر

لیکن اس کا صحیح اظہار اردو شاعری ہی میں ہوا ہے۔

حامیان قہقہے سے مگر کے میں غالب کی حمایت کرتے ہوئے نکلتے ہیں سیر  
ایران نے کہا تھا کہ ”قلع نظر از شاعری عالم بہ زبان پارسی است“ لیکن اہم بات یہ  
ہے کہ ان کی شاعری سے قلع نظر کی ہی نہیں جاسکتی۔ البتہ فارسی میں ان کی شاعری گہر



شاعرانہ کی تمام خصوصیتوں کے باوجود بیان کے مقررہ قائلوں سے انحراف نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف اردو میں ان کے بنائے ہوئے بعض قالب کافی لوگوں کو انجینی اور نامانوس معلوم ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے گہرے اثر سے بعد کے شعرا متاثر ہوئے۔ اردو میں فارسی تراکیب و محاورات اور فارسیت کی توانائی سے کام لیتے ہوئے انھوں نے جو پیرائے اختیار کیے، وہ بھی ان کی ادائے خاص کے شاہد ہیں اور نہایت یہ رواں انداز بیان بھی ان ہی کا ہے، جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے کلمہ سرا

صلائے عام ہے یاران کلمہ داں کے لیے

خود اردو کی اپنی مزاجی کیفیات رفتہ رفتہ غالب کے بیان میں آتی گئی ہیں۔ غالب نے دعویٰ کیا تھا کہ فارسی کی میزان یعنی تراوان کے ہاتھ میں ہے، لیکن اردو کی میزان وہ خود وضع کرتے ہیں۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ سعدی کی طرز نے بہ سبب سہل مستمع رواج نہ پایا۔ لیکن یہ اردو کا اثر تھا کہ وہ شیخ سعدی کی صلیب سہل مستمع کے قائل ہوئے اور خود اپنے بارے میں لکھا کہ ”خود ساختگی ہوتی ہے کہ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی قلم و نثر میں سہل مستمع اکثر پائے گا۔“ لیکن یہ وہ سہل مستمع نہیں جس کا ذکر محاسن شعری کے ضمن میں ملتا ہے اور جسے غالب نے خود بیان کیا ہے۔ اس کی صحیح تفسیر ان کے اس قول میں کہ ”مستمع در حقیقت مستمع اعظم ہے۔“ اور اس شعر میں ملتی ہے کہ:

میرے ابھام پہ ہوتی ہے تصدیق توضح

میرے اجمال سے کرتی ہے تراش تفصیل

اردو ایک بڑی تہذیبی زبان بننے کے عمل سے گزر رہی تھی اس کی وجہ سے غالب کی تحریروں سے ایسے اور خود غالب کو فائدہ پہنچا۔ اپنے دور کی معاشرتی ترقی اور انسانی کیفیات کا بھرپور تہذیبی اظہار ان کی اردو شاعری میں ہوا ہے۔ غالب کے ساتھ یہ کوئی زیادتی نہیں کہ وہ فارسی سے زیادہ اپنے اردو کلام کی نسبت سے بچانے جاتے ہیں۔ اردو کلام بجا طور پر ان کی شہرت کا سب سے بڑا سبب ہے۔



تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا، تو پھر یہ کیا ہے۔“ لیکن اس ”کیا ہے“ کا پورا احساس شاید غالب کو بھی نہ تھا۔ وہ ہرمندی پر نازاں تھے لیکن ان کی ہرمندی ہنر کے درجے سے حجاز، ہزار رنگ زندگی میں اپنا نفوذ رکھتی تھی۔

اسی طرح وہ پوچھتے ہیں کہ ”داد دینا اگر ریختہ پایہ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی صورت یہی ہوگی یا کچھ اور۔“ غالب کی شاعری ریختہ کے اعجاز کی آخری شکل ہو یا نہ ہو، اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی اردو شاعری کو کم و بیش نہیں سمجھتے تھے۔ غالب نے برصغیر کی سرزمین سے اٹھتی ہوئی آوازوں کو پہچانا، لیکن ان کا تہذیبی منظر زیادہ وسیع رہا ہے۔ سرزمین ہند کے پارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

جیسا کہ آفتاب لگا ہے شرق سے  
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور  
ہے اصل حرم ہند سے اور اس زمین سے  
کھلا ہے سب جہان میں یہ میدہ دور دور  
لیکن اس کے ساتھ اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ولی کی نسبت سے یہ  
بھی کہہ گئے ہیں کہ ”ہے اب اس معمورے میں قلوب غم الفت اسد۔“ اس سرزمین میں  
رہتے ہوئے وہ اپنے تہذیبی رشتوں کا اعتراف یوں بھی کرتے ہیں کہ:

غالب از آب و ہوا ی ہند بھل گشت نطق  
خیز تا خود را بہ اسفہان و شیراز اٹقم

☆

خلکیں غزال ہا کہ مٹلی بہ چچ وشت  
و مرغزار ہاے غنا و عشق بسیت

☆

ہے سانی ز فرنگ آید و شاہد ز خار  
ما عظیم کہ ہلداوے و بٹاے ہست

اسرار از تارکِ ترکانِ چنگی برودند  
بہ سخنِ ناصیہٴ قر کیانم دادند

☆

عالم از خاکِ کدورتِ خیر ہندم دل گرفت  
اصلہاں ہے، یزد ہے، شیراز ہے، تہران ہے

☆

عالم ز ہند نیست نوئی کہ میکشم  
کوئی ز اصلہاں و ہرات و قشم ما

☆

قر در محرق و عالم بہ دہلی  
سند در شط و مای در آتش

☆

یو عالمِ عدلیہ از گلستانِ مجم  
من ز غفلتِ طوطی ہندوستان نامیدمش

عالم کا اس برصغیر سے باہر کی دنیا سے واسطہ، قید وطن سے بیزاری اور مسلم طاقتوں کا ذکر کیا محض ان کی انا کے کرشمے ہیں یا ان کے پیچھے تاریخی اور تہذیبی صداقتوں کے علاوہ چادری صورتِ حال کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے؟ عالم ایک اجتماعی بے اطمینانی کی نشان دہی کرتے ہیں اور یہ بے اطمینانی جو بے شکوں میں چراغِ کہن کی آزمائش دیکھتی ہے، مظلوم کی سلطنت کا نام باقی ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے مختلف راہیں تلاش کرتی ہے۔ پھر بھی کسی سرزمین سے تعلق ایسا نہیں کہ جسے سرتاسر کا اہم کیا جاسکے۔ ہاں اس تعلق کے ساتھ اور اس تعلق کا شکوہ بچ ہوتے ہوئے بھی نئی تہذیبی وسعتوں کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ انسانی طور پر بھی یہ تعلق اور جدید معاہدے جس تہذیبی سانچے میں نمایاں ہوتے ہیں، وہ نئی آزمائش اور نئی جستجو برائے

مقامت کے لیے بھی اپنی ہی اجتماعی زندگی سے زیادہ طاقت پاتے ہیں۔ غالب کی فارسی شاعری کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن یہ طاقت غالب کی اردو شاعری میں زیادہ اثر دکھاتی ہے۔ اردو کے وہ اشعار جن میں فارسی کے شیعوں سے کام لیا گیا ہے اور وہ اشعار جن میں خود اردو کی اپنی لسانی صفات نمایاں ہوئی ہیں (اور ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں ہے) دونوں گہری تہجد کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ احساسِ زوال اور خواہشِ تہجد کے درمیان خود اردو نے ارتقائی مراحل طے کر دی تھی۔ ہمارا معاشرہ جس تاریخی آزمائش، سیاسی صورتِ حال اور تہذیبی کشمکش سے دوچار تھا اور خود اردو میں آگے بڑھنے کی جو سیلانہ کیفیت پائی جاتی تھی، اس کے اعتبار سے غالب کی اردو شاعری ایک نئے ذہنی منظر کا نشان بن جاتی ہے۔

اردو ادب نے غالب سے بڑا تہذیبی انقلابات کا صورت گر پیدا نہیں کیا ہے۔ ان کی نظم و نثر نے آئینہ خانے سجائے ہیں۔ وہ اپنے فارسی کلام پر فخر کرتے تھے لیکن رنجھے کو دھکب فارسی بنانے کے دعویدار بھی ہوئے ہیں۔ ایک طرف وہ مغرب کے جدید صنعت و حکمت کے کارناموں کی طرف تہجد دلاتے ہیں اور دوسری طرف وہ گزشتہ تہذیب کی بھترین روایات کے حامل بھی رہے ہیں۔ پھر انھیں روایات کے باقی کی حیثیت سے بھی بڑا درجہ حاصل ہے۔ غالب زمانہ شناس بھی تھے اور زمانہ متیز بھی۔ متعدد احساسات کی یکجہتی ان کی اہم خصوصیت رہی ہے۔ اس کا اعتبار ان کے منظرِ دربار سے تعلق اور انگریزی حکومت کے بارے میں خیالات، دونوں سے ہوتا ہے۔ منظرِ دربار کے تعلق سے ان کے ذہن میں ایسے تخیلات رہے ہیں کہ وہ زوال سے پہلے اس کے زوال کا احساس کر سکتے تھے اور شاید اسی فنی احساس کے ظاہری رویوں نے انھیں ایک مدت تک منظرِ دربار میں خاطر خواہ جگہ نہ دلائی اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی انگریزوں کے خلاف جنگ کے حاشی اور سطوتِ گزشتہ کے وفادار ان سے زیادہ خوش نہیں رہے۔ انگریزی حکومت کی بعض خوبیوں کے غالبِ دل سے قائل تھے لیکن اپنی ضرورتوں اور اس وقت کے حالات کے تقاضوں کے تحت بھی انھوں نے قصیدے لکھے ہیں اور کئی

غالب۔۔ نظر اور نگارہ

صورتوں سے انگریزوں کی تعریف کی ہے۔ البتہ ان کا استبدادی چہرہ بھی ان سے مخفی نہیں رہا ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ”وہ دلی نہیں جس میں اکبادن برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے، مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر بنو۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اثاثہ میں سے جو عزیزان ہیں کتھیاں اور جو جوان ہیں کتھیاں۔“ دلی اور غلامی دلی کے اجڑنے کا ماتم بھی ان کے خطوط میں کئی جگہ موجود ہے۔ عام حالات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ”جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے۔“ اس کے باوجود انھوں نے وہ قطعہ لکھا جس میں چوک کو قتل اور گھر کو زعماء کا صونہ کہا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی ایک غزل میں وہ انگریزوں کی مسلم دشمنی اور غیر مسلم نوازی کا ذکر کرتے اور کہتے ہیں کہ:

غیر سے چکھے کیا خوب دہای اُس نے  
نہ کسی ہم سے پر اُس مُت میں دفا ہے تو کسی  
اسی غزل کے دو اور شعر قابل ذکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:  
رنجِ طاقت سے سوا ہو تو نہ بیٹوں کیوں کر  
دہن میں خولِ تسلیم و رضا ہے تو کسی  
کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب  
شہرہ تجڑی شمشیر قضا ہے تو کسی

ان اشعار میں غالب کا سیاسی شعور جاگ رہا ہے۔ اسی سیاسی شعور نے ان سے پہلے کہلویا تھا کہ:

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر  
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناجز کو اہلی کرے

اور اسی کے تحت ۱۸۵۹ء میں میر مہدی محمود کے نام، ایک خط میں وہ دلی

کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

روز اس شہر میں اک عجم نیا ہوتا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

غالب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ "مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں"

لیکن اپنے خطوط میں بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ مثلاً "اخوان و اصحاب یا مقول یا

مطلق و اخر۔ ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔" "اے بھی مرشد لکھیں تو ایک کا لکھیں تو

نہیجے تو دو کا کیجیے۔ جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا بن آئے" میاں سینہ زار،

آزار، دلی کے عاشق و لداوہ، ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو

برا کہنے والے... نہ سخن دری رہی نہ سخن دانی، کس برے پر مٹا پانی۔" "لکھنؤ کی آبادی

میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔" "اللہ

اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے

حسن اعتقاد۔ اے بھلا خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں۔" یہی نہیں غالب کو دفتر

سرکار کی مہلت آٹاری بھی سادہ لوحوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ "سادہ لوحان آں را

مہلت آٹاری گوید۔" انھوں نے انگریزی حکمرانوں کو بے قیور اور قدر ناشناس بھی کہا

ہے۔ مگر اپنی انفرادی ضرورتوں اور معاشرتی متضاد رُخوں کے اعتبار سے ان کی تعریف

بھی کی ہے۔ تحقید و مذمت کے انتہائی حوالوں کے باوجود غالب نے زندگی بھر

انگریزوں کو خوش رکھنے کی کوششیں جاری رکھی ہیں اور ان کوششوں کے پوری طرح بار

آورد نہ ہونے پر انھیں انھیں دبا ہے۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے لیکن طبقاتی

تکلف ابھی تیز نہیں ہوئی تھی اور طبقات کی حدود و متضاد لہریں ایک دوسرے سے

بیزست نظر آتی تھیں۔ چنانچہ غالب بھی انگریزی حکومت میں رسائی کے خواہاں رہے۔

وہ کہتے ہیں کہ "گورنمنٹ کا بھات تھا، بھٹی کرتا تھا، غلعت پاتا تھا، غلعت موقوف،

بھٹی متروک۔ نہ غزل نہ مدح، بزل و بھو میرا آئین نہیں، بھر کو کیا لکھوں۔" لیکن

غالب جو اپنی شاعری کو بہت بڑا درجہ دیتے تھے جب اپنے آپ کو بھات قرار دیتے

ہیں تو یہ سیدھا سادھا بیان نہیں، اس میں حالات پر اور خود اپنے آپ پر طنز کی بڑی شدید زیریں لہر ملتی ہے، جو شاید غفلتی ہو لیکن ایسی غفلتی بھی نہیں۔ غالب کی مجموعی یوآئی اُن کی سیاسی وابستگی یا سیاسی بیانات میں نہیں۔ جب صحیح انتھائی عمل کی راہیں روشن نہ ہوں اور تاریخی حالات فیصلے کا اشارہ نہ کریں تو انسانی فکر کو معاشرتی اور فکری تضادات کے مختلف مراحل سے گزرتا پڑتا ہے۔ غالب کی یوآئی یہ ہے کہ زندگی کی کشن اور پرستش راہوں سے گزرتے ہوئے انھوں نے پیش قدمی کا ثبوت دیا، دل کش و موثر بحالیاتی پیکروں میں انسانی فکر کا اثبات کیا اور ان کی شاعرانہ خیال آرائی سے مستقبل کی تہذیبی راہیں روشن ہوئیں۔

مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heidegger) نے کہا تھا کہ زبان سے اپنے زیادہ نزدیکی تعلق کی وجہ سے شاعر، انسانی وجود کی کھنکھس کو مابعدالطبیعیاتوں سے زیادہ بہتر طور پر پیش کر سکتے ہیں اور ان کی زبان ایسی معادلاتی (Eschatological) قوت رکھتی ہے کہ جس کا تجزیہ ہم عام تحقیدی حوالوں سے نہیں کر سکتے بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک ایسا انکشاف سمجھ سکتے ہیں جسے ہم محسوس کرنے کی امید تو رکھتے ہیں لیکن جسے ایک تصور کی طرح ہم اپنی تحقیدی گرفت میں نہیں لاسکتے۔ لیکن یہ مابعدالطبیعیاتی رجحان رکھنے والے ایک وجودی فلسفی کی رائے ہے۔ اس میں کبھی ہوئی سچائی کو کرستوفر کاڈویل (Christopher Caudwell) جیسے مادی نقطہ نظر رکھنے والے نقاد نے شاعری کی غیر عقلی خصوصیت بتایا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق جن معنوں میں ایک سائنسی دلیل عقلیت پر مبنی ہے، ان معنوں میں شاعری نہیں، کیوں کہ اس میں اندرونی حقیقت سے قائل اور مناسبت بھی ملتی ہے۔ اس کا یہ قول خرد پندگی کی مخالفت میں نہیں صرف شاعری کے پیچیدہ عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعری میں جو وقتی اور تہذیبی انکسارات ملتے ہیں، وہ اندرونی صورت پذیری کی صلاحیتوں کے باوجود بیرونی دنیا سے ماسٹھیں رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی یکپائی شاعرانہ طاقت بن جاتی ہے۔ البتہ شاعرانہ منطق الگ نوعیت کی حامل ہے کہ اس میں اندرونی اور بیرونی تضادات بھی نئی بحالیاتی وحدتوں



میں داخل جاتے ہیں۔ غالب کی شاعری کا جائزہ لیں تو قصوریت اور ماقبہیت دونوں کی پرچھائیاں ایک دوسرے سے ملی جلی، ایک دوسرے سے سرگرم ستیز اور ایک دوسرے کی مماثل نظر آتی ہیں۔ ان کے شاعرانہ تخیلاتی پیکر ایک نئے معاشرتی وجود کا احساس دلاتے اور ایک نیا تہذیبی منظر پیش کرتے ہیں۔ جہاں عبدالرحمن چغتائی کو غالب کے اشعار نے مثل مصوری کے نمونوں سے الہام حاصل کرنے کی ترغیب دی، وہاں فیض جیسے انسان دوست شاعر کے کئی مجموعوں کے نام بھی مستعار غالب رہے ہیں۔

غالب کی اردو شاعری کے فارسی سے متاثر اور اردو کی اپنی خوبیوں سے مزین دونوں رنگوں میں زندگی کی سرپائی اور مستقبل کی تہذیبی سمتوں میں روانی کے نقوش ملتے ہیں۔ دونوں سے اردو کے سرمایہ بیان میں اضافہ ہوا ہے۔ غالب کی شاعری ایک ایسی قوت کا پتہ دیتی ہے جہاں نفی سے بھی اثبات کی تراوش ہوتی ہے۔ ان کے شاعرانہ پیکر ایک نئے معاشرتی ربط اور ایک نئی تہذیبی وسعت کا پتہ دیتے ہیں۔ انہیں کی یہ شاعرانہ فکر:

انہیں دم کا بھروسہ نہیں ظہر جاؤ

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اپنے طور پر اپنی مکمل ہے کہ اسے نزاکت خیال اور ایک پورے دور تہذیب کی نکست و لطافت کا ایسا محضہ کہا جاسکتا ہے کہ جس پر اضافہ ممکن نہیں۔ لیکن یہی شاعرانہ فکر جب غالب کی شاعری میں ”سور گرووں“ ہے چراغ رہ گزار بادیاں“ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے تو اسے ہی زندگی کی لڑش کے دیر اثر مشاہدے کی عظمت کا نقش کہا جاسکتا ہے۔ جس میں نوال کے ماتم سے زیادہ نگارے کی وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ یقیناً غالب کے بعض فارسی اشعار ان کے اردو اشعار سے بہتر ہوں گے لیکن اردو زبان سے ان کا نزدیکی تعلق ایک ایسی صریح حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس تعلق سے ان کے اردو کلام میں جو لہجہ اور تپائی آئی ہے وہ اردو شاعری میں ایک نئی تہذیبی طاقت اور صفت کا مظہر بن گئی ہے۔ غالب ہی کا ایک لہجہ خوب

قاری شعر ہے کہ:

آغشتِ ایم ہر سر خارے پہ خونِ دل

کانوں باغیہلی سرا نوشہ ایم

لیکن جب وہ اردو میں کہتے ہیں کہ:

کانوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پا دانگی پُر خار میں آدے

تو یہ شعر قسیم اور قنار کا ایسا بیکر نظر آتا ہے کہ جس کی نظیر مشکل ہے۔

غالب کی شاعری نے جو تہذیبی مضر دیا ہے، اس نے مستقبل کے آئینوں کو

جکڑ گادیا ہے۔ غالب جو اپنا رشتہ سلاطینِ مملکت سے ملانے کا جن کرتے رہے تھے، ایسی

ناویدہ لڑخوں سے قوت پاتے ہیں جن کا سرچشمہ عمومی زندگی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا

جائے تو غالب خود اپنی شخصیت سے بالاتر شخصیت رکھتے تھے۔ الہدٰی ان کی شخصیت میں

بالاتر معاشری برقیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ غالب کی ذاتی کم زوریاں

اپنی جگہ، لیکن ان کی فنی بڑائی یہ ہے کہ ان کی نظر نے ہمیں دیکھنے کی صلاحیت بخشی اور

ہمارے فکری اور تہذیبی دھارے کا رخ بدل دیا۔

خسرہ نے ترکی الاصل ہوتے ہوئے بھی برصغیر کی جانب تہذیبی میلان رکھا

اور غالب نے ترکی الاصل ہو کر ہند مسلم تہذیب کو وسط ایشیائی ثقافت کی طرف مائل

کیا۔ اس ہند مسلم تہذیب کی تشکیل میں پہلے بھی برصغیر سے باہر کے تہذیبی عناصر شامل

رہے تھے لیکن غالب کی اس ثقافت کی دریافت تو میں احوالِ حال نے بھی حصہ لیا ہے۔

مغلوں کے دور تک برصغیر کے مسلمانوں کو وسط ایشیا سے وہ جذباتی لگاؤ نہ تھا جس نے

مغل سلطنت کے خاتمے کے بعد وسعت پکڑی۔ لیکن گرد و پیش کے احساسِ زوال کے

تحت غالب نے اس جانب پہلے ہی قدم بڑھا دیے تھے۔ جس طرح غالب کو یہ احساس

زوال تھا اسی طرح وہ نئی تہذیبی قوتوں کو بدوئے کار آتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مغلوں

کے آثارِ زوال کے ساتھ ہی معاملاتِ سیاست سے سروکار رکھنے والوں کی نظریں

دوسرے مسلم ممالک کی طرف اٹھی ہیں۔ غالب ان معاملات سے دور تھے۔ لیکن اُن کی ہند مسلم تہذیب کی ناسمجہ شاعری برصغیر سے باہر کے مسلم تہذیبی رنگوں کو جذب کرنے کی خواہش کا وسیلہ بن گئی۔ غالب نے اس تہذیب کے افکار و تصورات پر شدید تنقید بھی روا رکھی ہے لیکن یہ تنقید بھی انہیں اس تہذیب کے دائرے سے جدا نہیں کرتی۔ اوہی ہنگاموں سے لے کر غالب کی آزادانہ اور ناقدانہ بصیرت تک ہمیں مسلم تہذیب کی ترجیحات نظر آتی ہیں۔ وہ آزاد خیالی کے باوصف جب دوسروں کی ڈھونڈیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے اور مسجدوں کے گنبد ڈھائے جاتے دیکھتے ہیں، تو سخت افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے حاسف اور ان کی تہذیبی توسیع کی خواہش سے اُن کی وسیع المشرقی کی ٹہنی نہیں ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

گردشِ ساغرِ مدِ جلوہ رکھیں تجھ سے  
آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے

☆

ہے پرے سرحد اوراک سے اپنا مسجد  
قبلہ کو اہل نظر قبلہ لنا کہتے ہیں

☆

نظر میں ہے ہماری چادہ رانو فتا غالب  
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

☆

نہیں ہے سجد و زعار کے پھندے میں میرا  
دقاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

آزاد خیالی کی وسعت اور انسان دوستی کی توانائی مختلف واسطوں سے محسوس کی جاسکتی ہے اور غالب نے اسے محسوس کرنے کا ذریعہ ہند اسلامی تہذیب کے وسط ایشیا کی جانب میلان کو نکالا ہے۔ پھر اس کی سرحدوں میں بھی توسیع کرنا چاہی ہے۔ وہ

کہتے ہیں کہ:

اسد کو نت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے

نہاں ہیں تلاءِ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

اس ہندو مسلم ثقافت کو جس کا وسط ایشیا کے تہذیبی رنگوں سے میل ہے، غالب نے فریدوں و جم و گنجرو و داراب و بہمن کے ذکر، جزوہ کے قصے، دجلہ و جیحون اور مادراء النہر کے بیان ہی سے نہیں سمایا، اسے اپنے تہذیبی رُخ کا آئینہ بھی بنایا ہے۔

مستقبل کی انسانی تہذیب، مختلف تہذیبی رنگوں کا ایسا گل دست بنے گی کہ ہر رنگ دوسرے رنگ کی زیبائی میں اضافہ کرے گا، اسے مٹانے کے در پے نہ ہوگا۔

غالب کی شاعری میں جو ذہنی حرکت، شاعرانہ دلچسپی اور تنقیدی بصیرت موجود ہے، وہ ایسے عناصر ہیں کہ مستقبل کی انسانی تہذیب کی تعمیر کے ضروری اجزاء کہے جاسکتے ہیں۔

غالب کی شخصیت کو حالی نے حیوان طریف کہہ کر ایک رُخ کی جانب اشارہ کیا ہے، لیکن ان کی یہ غرافت بھی اعلیٰ جمیدگی کی مظہر ہے۔ پگالہ حالی سے کم غالب شمس نہیں

تھے کہ خامسے میں بھی انھیں غالب کے ارفع خیالات کی گرفت کا اندازہ رہا ہے اور آزاد خیالی کی بہرہ آرمائی میں اس نیرو پیشہ کے پیش نظر غالب کی مثال رہی ہے۔ وہ شاعرانہ

فکر جو سیر کے واسطے تصویر سی فضا اور سعی کی خاطر فردوس میں دوزخ کو ملا لینے کی خواہش کا اظہار کر سکتی ہے، وہ ایک سلسلہ تہذیب سے تعلق رکھتے ہوئے بھی کب وسیع

انسانیت کی راہوں میں ناخصلافانہ حدود و قیود کی پابند رہ سکتی ہے؟ وہ سلسلہ تہذیب جو ہندو مسلم ثقافت سے وسط ایشیا کی جانب پھیل رہا تھا، تہذیب دشمن قوتوں کی شکست اور

حاکمیت انسانی تہذیب کی رنگارنگ ثروت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

غالب کی وفات کے سو سال بعد یہ سوال اٹھا تھا کہ کیا ان کا سرزمین

پاکستان سے کوئی تعلق ہے؟ ان کی ولادت کا دو سو سالہ جشن مناتے ہوئے ہمیں اس کا

جواب دینا ہے کہ غالب کی شاعرانہ فکر کا انسانیت کے معاشرتی تقاضوں اور عالمی انسانی

تہذیب سے کیا رشتہ ہے؟

چاک گریباں کو ہے ربطِ تاغلِ جنوز  
 فنجے میں دل تنگ ہے حوصلہٴ گلِ جنوز (غالب)

حدود و قیود سے آزادی کی پہلی شرط خود آرزوئے آزادی ہے اور غالب کی شاعری اس آرزوئے آزادی کی نہایت شاعرانہ تشبیہوں میں صورت گری کرتی ہے۔ لیکن یہ سارے تہذیبی اشارے بھی غالب کی کلیتہً شعور کی نمائندگی نہیں کرتے۔ غالب کی شاعری نے جہاں تہذیب اور ماحول کے نشانات فراہم کیے، وہاں انسان کی آرزو و معنی اس کے وجود کے کرب اور اس کے محصورہ کمال کے شعور کی ترجمانی بھی کی ہے۔ انسان ہی ان کا موضوع اور معروض ہے۔ وسیع المشرَب انسان دوستی کے ساتھ غالب کے افکار میں وہ تخلیقی حرکت اور ناقدانہ بصیرت بھی موجود ہے، جس کے بغیر معطل کی انسانی تہذیب کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔ ان کی بعض تہذیبی ترجیحات تاریخی عوامل کا نتیجہ تھیں۔ لیکن وہ تمام تہذیبوں کے درمیان انسانی سہی زندگی کا تصور رکھتے تھے۔



## نظر غالب اور نظارۂ عصر حاضر

برصغیر میں قرون وسطیٰ کی تاریکیوں سے گزر کر کلچر عصر حاضر کی اذلیں روشنی پیش کرنے کے سلسلے میں مسلم تاریخ کے عین نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ، غالب اور میر تقی۔ شاہ ولی اللہ بھی غالب اور سرسید کی طرح مسلمانوں کے دور زوال کی پیداوار تھے۔ اگرچہ وہ اس زوال کو روکنے کے لیے سیاسی اور فکری طور پر ساری زندگی مصروف عمل رہے۔ ان کی عملی سیاسی خدمات سے قطع نظر صرف فکری طور پر دیکھا جائے، تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ تاریخ پر کتنی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ تاریخ میں قوموں کے زوال کا جائزہ لیتے اور خود اپنے زمانے میں ان ہی اسباب زوال کی کارفرمائی سے مسلم معاشرے کو زوال کی پستیوں تک جاتے ہوئے پاتے، اس جانب توجہ دلاتے اور اس کے تدارکات بھی تجویز کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ طبقاتی مکملش کے چدلیاتی عمل کے تصور سے تقریباً سو سال پہلے ریاستوں کے قیام و بقاء کے لیے طبقات میں تضاد کی جگہ توازن کو ضروری قرار دیتے اور توازن و انصاف کو معاشرتی ترقی کی بنیاد بتاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے افکار دینی سوچ میں ایک نئی تحریک استوار کرتے ہیں، لیکن وہ صرف دین تک محدود نہیں بلکہ اپنے زمانے میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے حرکت و جدوجہد کا پیغام دیتی ہے۔ ان کے معاشرتی عظیم کے تصورات عقلی بنیادیں رکھتے ہیں۔ وہ انسان کے حقوق و



بجائے حقیقت کی روشنی کا سامنا کرنے کی ہمت پائی جاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کا مذہبی انسان، سرسید احمد خاں کے سیاسی انسان اور عالم کے انسان مطلق میں بدل جاتا ہے۔ لیکن انسان کے ان تینوں تصورات میں پہلے کے اثرات کے ساتھ ساتھ جدید حالات کے نقوش بہت واضح ہیں۔ سرسید احمد خاں نے اپنی قوی خدمات کے حوالے سے کہا تھا کہ:

قوم ما اے قوم ما از بہر تو

دادہ ام بر باد ننگ و نام را

عالم کو اپنے زمانے میں جن نا انصافیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، ان کے نقوش نظر وہ کہتے ہیں کہ:

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف

آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

لیکن ان کا انسان مطلق کھلی آنکھوں سے دنیا کا نظارہ کرتا اور کہتا ہے کہ:

میں چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب

لیکن عہد کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

عالم اپنے فن کے حوالے سے جہاں اپنے آپ کو سب زمانوں سے وابستہ

کرتے اور کہتے ہیں کہ:

”مباحث منکر عالم کہ در زمانہ تست“

وہاں وہ قدمے بے ولی سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ:

کو کم را در عدم اوج قبولی دادہ اند

شہرت شہرم بکشتی بعد من خواہ شدن

عالم کو اپنے زمانے کی صحیح مخالف کی شکایت دی ہے۔ وہ ”مہرباب دیا“

کے شاکی رہے ہیں اور شاید ہر زمانے میں انسان کو ان ذہنی کیفیات سے گزارنا پڑتا ہے۔ لیکن عالم سوچا ہے ویاہر چمن کے کھلنے کا منظر بھی دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ یہ حال



میں موجود مستقبل کی ایک جھلک ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو ماضی کا نقشہ کر بھی پاتے اور شاعرانہ انداز سے کہتے ہیں کہ:

ہے نازِ مطلقاں زو از دستِ رفتہ پر

ہوں گلِ فردوسیِ شرقیِ داغِ کہنِ ہنوز

غالب کا ذوقِ رفتار کسی ایک منزل پر نہیں رک جاتا۔ انسان کی تاریخ کا سفر جاری رہتا ہے۔ وہ جتنی منزلیں بھی طے کرے، نئی منزلیں سامنے آتی جاتی ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ:

نہ ہوگا یکِ بیاباں مائگی سے ذوقِ کم میرا

حبیبِ موجدِ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

یہ نقشِ قدم شاعر غالب کا نہیں، مطلق انسان کا نقشِ قدم ہے۔

غالب اپنی وسیع البشری کا اظہار ”ترکِ رسوم“ میں کرتے، اسے اپنا کیش قرار دیتے اور نثر میں کہتے ہیں کہ ”بندہ پرورد میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں۔“ بعض تہذیبی واسطے اور تہذیبی ترجیحات یا وابستگیوں کے حبِ بنی آدم کے تصورِ مطلق میں حائل نہیں۔ کیوں کہ جس انسان کو وہ عزیز رکھتے ہیں، وہ ہر دور اور ہر معاشرے میں غم سہ رہا ہے۔ ان کا یہ احساس صرف گرد و پیش کی فوری صورتِ حال سے وابستہ نہیں بلکہ وہ اس کی کائناتی کیفیت کا ادراک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لرزتا ہے سرا دلِ زحیفِ میرِ درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

غالب ”معارفِ خانہِ ذخیرہ جز صدِ معلوم“ کہنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں لیکن ان کا انسان مطلق رنگ لارہ دگل و نرس جدا جدا ہوتے ہوئے بھی ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہتا ہے۔ ”نالہِ سراپہ یکِ عالم و عالم کفِ خاک“ اور ”کفِ انیسویں ملتا صہبِ تہجدِ حنا ہے“ جیسی متعدد و متنوع کیفیتوں سے گزرتے ہوئے غالب کا انسان کشمکشِ اضمداد کی اس منزل تک بھی پہنچا ہے جہاں اسی کشمکش سے نئی حقیقتیں نمودار ہو رہی ہیں۔

غالب کو دنیا کے حال سے باہمی اور انسان کے حال پر تاسف بھی ہوتا ہے وہ ان تمام عناصر کا اجتماع دیکھتے ہیں جو انسان کو بے یقینی اور اذیت کی جانب لے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی ایسی کلکت و ریخت اور سراسیمگی کے عالم میں بسر ہو رہی ہے کہ انسان کی ذاتی سالمیت اور ذہنی طمانیت کی کیفیتیں ہر وقت خطروں سے دو چار رہتی ہیں۔ اس اندھیرے میں خود انسان کا ذہن ہی روشنی بخشتا ہے۔ غالب کو انسان کی اس صورت حال کا پوری طرح احساس ہے مگر وہ اذیت و غم کی متعدد و متنوع کیفیتوں سے گزرتے ہوئے غی حقیقتوں کا سراغ پاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان مطلق کی ایسے صورت حال کا اور اک خود اپنے اندر سامانِ ترکیب رکھتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ:

کارنامہ ہستی میں لالہ داغِ ساماں ہے  
برقِ خرمین راحتِ طوبی گرمِ دہقان ہے



کشفائش ہائے ہستی سے کرے کیا سہی آزادی  
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصتِ روانی کی

غالب کے ایسے بعض تجلیات کا سلسلہ جہاں کل کے سلسلہ تصوف اور آج کے انکار و جبروت سے جوڑا جاسکتا ہے۔ وہاں یہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ تعقل کا رویہ اور خارجی دنیا کے حقائق کو اپنے طور پر تسلیم کر لینے کی صفت اس معاشرے کے گہرے مطالعے سے آئی ہے، جہاں مسلسل صورتیں بن اور بگڑ رہی تھیں۔ پھر سرسید کی مغولیت پسندی اور غالب کے عقلی رویے میں بھی فرق ہے۔ سرسید احمد خاں نے عقلیت پسندی کے سبب چراغِ جلائے ہیں اور ایک نئے علمِ کلام کو فروغ دیا ہے۔ لیکن ان کی عقلیت کسی نگری حاصل کی طرف لے جاتی ہے۔ غالب کا مطالعہ انسان مطلق زیادہ عمیق ہے اور اس کا حوالہ صرف نیست اجتماعی نہیں۔ وہ سچ اجتماعی سے غافل نہیں ہوتے لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ افراد اور گرد و بان افراد کے راستے بے سستی کی جانب بھی لے جاتے ہیں۔ غالب کا عقلیت پسندانہ ذہن اور ان کا اور اک بے حاصلی کو بھی ایک صورتِ احوال

جانتے اور قبول کرتے ہیں۔

مشہوری اور کبر بار میں غالب روایات مصوف کے زیر اثر کہتے ہیں کہ:

جہاں محبت آئینہ آئینگی

فضائے نظر کا وہ وجہ الٰہی

لیکن ہفت الفاک کو جام ہائے داغوں کے مانند دیکھنے والے غالب میں ترجیحات کو مفاہات میں بدل دینے اور احوال کی تبدیلی سے پیدا ہونے والی صورت حال کو نیا مفہوم عطا کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ چنانچہ غالب کے خیال میں نگار کو الفت نہ ہو (کہ یہ ایک آئیڈیل صورت حال ہے) تو روانی روش و سستی ادا کی خوبی تو بیان کی جاسکتی ہے۔ بہار پاکدار نہ کسی لیکن لکڑے موجود میں طراوت چمن اور خوبی ہوا کو تو سراہا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں اس سے بھی آگے بڑھ کر اور اپنی اس کیفیت سے گزر کر جہاں وہ پیدل ہائے تماشا کے ہاتھوں ”ہرزہ ہے نغمہ“ زیر و بم ہستی و عدم“ کہتے ہیں، وہاں اگر تحمل مفہوم اور ادراک معنی کی طاقت نہ ہو تو جلوہ ہائے صورت کو بہت قیمت جانتے، کا درس بھی دیتے اور کہتے ہیں کہ:

ضمیں مگر سرد برگ اوراک معنی

تماشائے نیرنگ صورت سلامت

یہ نظیر اکبر آبادی کے ”آوی نامہ“ کی طرح انسان مطلق کی فتح ہے کہ اس کی شناخت کے لیے کسی نیچے کار یا کارنامے کی ضرورت نہیں صرف انسان ہونا کافی ہے۔ یہ ضمیں کہ غالب نے انسان کو تمام امکانات سے مملو نہ پایا ہو۔ غالب اقبال کی طرح شوق کو ادراک بھر کی تازہ کاری کا سامان طراز پاتے ہیں۔ وہ ذرے کو صحرا دست گاہ اور قطرے کو دریا آشنا دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کے زمانے میں حالات و اقدار کی جو وسیع سطح جاری تھی اور سب دنیا اور تمام زمانوں میں وہ انسان کے احوال کا جس طرح تجزیہ کرتے ہیں، اس نے غالب کو ایسی عظمت عطا کی جو انسانی اقدار کو کیفیات کی خصوص صورت حال میں دیکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں کیفیات بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ مگر وہ عظمت سے بھی کام

غالب... نظر اور نگار

لیتے ہیں۔ اگرچہ اس عقلیت کو وہ کیفیت کا جزو بنانا بھی جانتے ہیں۔ اسی عقلیت نے غالب کو ایسے انسان مطلق کا شعور بخشا جو زندگی کی تمام راہوں کے متفرع و متغیر احوال میں، خود اپنی بدلتی ہوئی صورتوں کے ساتھ، صورت انسان کا اثبات کرتا ہے۔ اور یہ صورت انسان متغیر الاحوال ہے یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں کسی مضبوط قلمی کی جگہ ایسی خیال آرائیاں ملتی ہیں، جو فانوس خیال کی طرح متعدد گردش کرتی ہوئی تصویروں کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن ہر تصویر پر انسان کے دخل و ثبت ہیں۔ ان کے تمام انکار کی مرکزیت انسان سے قائم ہے۔ لیکن اس کے اتنے پہلو، اتنے گوشے اور اتنے جلوے ہیں کہ نگاروں کے متعدد زاویے یہاں آسودہ ہو سکتے ہیں۔

غالب جو خاک پاک توران سے نسبت رکھتے اور ترک نژاد ہونے پر مغرور تھے جب ”شد تیر غمکے نیا کاں قسم“ کہتے ہیں تو ان کا قلم بھی زندگی کے مقابلے میں ہتھیار بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اہداد کے انفرسیاب اور چشک کی نسل سے تعلق رکھتے اور ان کے صاحب فرد جاہ و جلال، فرماں روا ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن زندگی کی رزم گاہ میں وہ اکثر ایسے مطلوب بھی ہوئے ہیں کہ اپنا گھٹس بھی انھیں نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہر کیا غالب تخلص در نزل بنی مرا

ی تراش آں را و مطلوبی بجا پیش می نویس

لیکن صرف وہ نہیں ایک قوم متفرع و مطلوب ہو گئی تھی۔

غالب اور سرسید دونوں نے اس نئی صورت حال سے مفاہمت کر لی تھی۔ سرسید نے اپنے ایک لکچر میں کہا تھا کہ ”فرد میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی خاندان برباد و جاہ ہوئے، ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شوق کرنے والا ہے۔“ سرسید کا دل دردمند بالآخر انھیں اصطلاح کی اس راہ پر لے گیا، جہاں وہ مسلم قوم کے لیے نئی بیداری کا پیغام بن سکے۔ وہ اس اندمیرے میں روشنی کی کرن ثابت ہوئے اور ان کے کارناموں سے مسلم قوم جو پستیوں کا شکار ہو گئی تھی،

پھر برصغیر کی سیاست میں ایک قابل ذکر عنصر کی حیثیت سے سامنے آئی۔ غالب بھی اعلیٰ خد سے متاثر ہوئے۔ بعد میں سستہ کہنے اور ”بادشاہ باغی کی خوشامد“ کے جرم میں انگریزی حکومت کی ناخوشی کا شکار ہو کر ”اعادۂ عزت“ کی آرزو کرتے رہے۔ وہ پھر اس پر خوش ہوئے کہ ”میں انگریزی سرکاری میں طلاقہ ریاست دو دہائی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔“ مگر یہ وہی غالب ہیں جو نئے خاتہ جنوں کے ساغر کش ہیں اور کہتے ہیں کہ:

نہ پوچھ و سچ سے خاتہ جنوں غالب

جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک امداد

زندگی کے مقابلے میں شکست کھا جاتا بھی حقیقت کا ایک رخ ہے۔ انسان مطلق کی تعمیر صرف اس کی فتح مندی سے نہیں، اکثر اس کی شکست سے بھی ہوتی ہے۔

دوسرا رخ غالب کی شاعری کا وہ انتہائی پہلو ہے، جو زندگی اور مصیب زندگی میں بنیادی تبدیلی کا خواہاں اور دوست جہد ہے۔ خواہ یہ دھوت جہد صرف افکار تک محدود ہو۔ لیکن غالب کی شاعری میں، جس طرح مفاہمت بلکہ مفاہات کے جلوے نظر آتے ہیں، اسی طرح مزاحمت بلکہ مزاحمت نے بھی اپنا اثر دکھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

تغلا بہ گردشِ بطلِ گراں بگردانیم

اپنے افکار کے اعتبار سے غالب زندگی کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مفاہات اور مزاحمت ایسے عناصر تھے کہ جن کے ذریعے غالب ایک اجتماعی ہمسرت کی آواز بن سکے تھے اور ان کی لادہ شخصیت نے ان کی ذلت سے بالاتر حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہ بالاتر شخصیت ان کی زندگی کے کوائف سے زیادہ ان کے فن کے آئینے میں ظاہر ہوئی ہے۔ غالب کی ذاتی کمزوریاں اپنی جگہ لیکن ان کی فنی بڑائی یہ ہے کہ ان کی نظر نے ہمیں انسان مطلق کا نظارہ بخشنا اور ان کے تخیل نے زندگی کے وسیع منظر کا احاطہ کیا۔

غالب۔ نظر اور طائر

غالب کی شاعری میں سوچ کے پہلو خود عصر حاضر کی گواہی دیتے ہیں۔ صدیوں کی قائم شدہ روایتوں میں تبدیلیاں ہوتی تھیں اور انسان کے احوال و اقدار بدل رہے تھے۔ لیکن انسان کا غیر انسانی صورت حال کا غم اپنی جگہ قائم تھا۔ مگر انسان کے احوال میں انقلاب کی تازگی و توانائی کے مضر ہونے کا راز ظاہر ہو چلا تھا۔ غالب کی فکری ہسیرت نے عصر حاضر کی تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا۔ اگرچہ یہ تبدیلیاں انگریزوں کے ذریعے عمل میں آئی تھیں۔ غالب کا یہ انداز فکر سرسید کے لیے بھی ایک وقت میں انوکھا بلکہ غیر پسندیدہ ثابت ہوا۔ لیکن اس کا غالب کے کلام میں در آنا کوئی اچھا نہیں کیوں کہ وہ ہر نسل کی نئی صورت گری کے چاکل تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہامن میادیز اسے پدر فرزند آذر را مگر

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش کرد

غالب جامہ فکلی کے خلاف اور ذمگی کی نئی صورتوں کے خواہاں تھے۔ انھوں نے انگریزوں کی لائی ہوئی ایجادات جدید کو سراہا اور آئین و کر کو تقویم پار قرار دیا۔ کیا اسے صرف انگریزوں کی ”بھٹی“ سے منسوب کیا جائے؟ شاید ایسا نہیں ہے۔ غالب کی شاعری آج کی سوچ سے قریب ہے۔ وہ تبدیلی کے عمل کا انسانی ذہن کے عمل سے رشتہ جوڑتی ہے۔ جدید ایجادات میں پہلی بار اس وسیع پیمانے پر انسانی ذہن کی صلاحیتیں ظاہر ہوئی تھیں۔ سرسید نے ابوالفضل کی تصنیف ”اکبر نامہ“ کے حصہ ”آئین اکبری“ کی تصحیح و تدوین کے بعد اسے ۱۸۵۶ء میں شائع کرایا چاہا تو غالب سے تقریر کی فرمائش کی تھی۔ غالب کی تقریر کے طور پر قدرے طویل مثنوی انگریزوں کی لائی ہوئی جدید ایجادات کو سراہتی ہے لیکن اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ انھوں نے قدیم و جدید کے فرق کو بچھاؤ اور اپنی رائے جدید کے حق میں دی ہے۔ اس طرح ان کا یہ بیان ذہن کی دو درجہ بندوں کا بیان بھی بن جاتا ہے۔ یہی اس کی اہمیت ہے۔

اب ان ایجادات کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بلکہ اس دور میں جو نیا سائنس اور تکنیکی انقلاب رونما ہوا ہے، اس نے دنیا کی صورت بدل دی ہے۔ نئی سائنسی ایجادات

نے پہلے سے کہیں زیادہ سیاسی و معاشی اتصال کو عام کر دیا ہے۔ ان سے خطرات کی متعدد ہی صورتیں بھی سامنے آئی ہیں۔ نئی ایجادات نے ہوا، پانی، زمین، نباتات، حیوانات اور خود انسانی زندگیوں کو آلودہ کر دیا ہے بلکہ خود نوع انساں کی زندگی معرض خطر میں ہے۔ کیا عالم کے مذکورہ اشعار اب بھی قابل قبول رہیں گے؟ ہومر نے یونان کے دیوتاؤں اور سوراؤں کے گیت گائے تھے لیکن اس کی شاعری اب بھی عالمی ادب کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ پھر عالم کی شاعری تو آج کی سوچ کے بھی قریب ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے لیے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیوں کو رد کر سکیں۔ ترقی پذیر اور کم ترقی یافتہ ممالک بھی ان ترقیوں کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ اگرچہ متعدد علاقوں میں ابھی پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں ہے۔ لیکن جمہوریت کی خرابیوں کا علاج مزید جمہوریت کو بتایا گیا ہے تو کیا ٹکنالوجی اور سائنس کی لائی ہوئی خرابیوں کا علاج مزید سائنس اور ٹکنالوجی سے ہو سکتا ہے؟ لیکن مزید جمہوریت کے تصور میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کی بھڑدی کے تصور کا عالم ہونا بھی شامل ہے۔ اسی طرح مزید ٹکنالوجی بھی اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب انسان کو مرکزیت حاصل ہو۔ عالم کی شاعری کی بڑائی یہ نہیں ہے کہ اس میں انگریزوں کی لائی ہوئی ایجادات کی مدح سرائی ملتی ہے بلکہ اس کی اصل بڑائی یہ ہے کہ انسان کے اعمال و احساسات کی رنگا رنگیوں کو آفاقی دھنوں میں پیش کیا گیا اور انسان مطلق کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔

عالم کی وہ نظر جو زوال کے آچار و قور زول سے پہلے ہی دیکھ رہی تھی، اسی نے مضائقہ کی راہوں کو بھی جھکا دیا ہے۔ عالم کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آج کے ذہن سے مخاطب ہوتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ماہرٹ فراسٹ نے بہت صحیح کہا تھا کہ "ایک ماڈرن (جدید) شاعر وہ ہے جو جدید لوگوں سے بات کرتا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ کس زمانے میں ہوا تھا۔" آج کا انسان جو ذہنی آسودگی کا غم، ماحولیاتی آلودگی کا ستم اور اپنی مکمل چاہی کے اندیشوں کا دکھ جھیل رہا ہے، اپنے آپ کو عالم کی شاعری سے بہت قریب محسوس کرتا ہے۔ وہ اب اقتدار کے مٹ جانے اور ان

غالب... نظر اور ظاہر

کی جگہ صرف غلام جانے کا منظر بھی دیکھ رہا ہے۔ ایسی صورت میں غالب کی شاعری جس میں صرف انسان ہونے کا استحقاق کافی ہے، اس کے لیے بڑا سہارا بن جاتی ہے۔ آج سارے عقائد و تصورات تہہ و بالا ہو رہے ہیں، ایسی صورت میں غالب کی شاعرانہ بصیرتیں ہی بار بار رونما ہونے والی انسانی کیفیتوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

تمثال جلوہ عرض کر اے حسن کب تک  
آئینہ خیال کو دیکھا کرے کوئی

اور

عالم خمار دشتِ بھنوں ہے سرسبز  
کب تک خیال طرۂ ایلا کرے کوئی  
چاکِ جگر سے جب رو پرش نہ دا ہوئی  
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی  
ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ نکست  
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی  
سرور ہوئی نہ وعدہ میر آرا سے عمر  
فرست کہاں کہ تیری قننا کرے کوئی  
ہے دشتِ طہیجِ لہجہ پاسِ خیز  
یہ درد وہ نہیں ہے کہ نہ پیدا کرے کوئی

اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ سبک بندی یا سبک داری کی راہوں سے گزر کر غالب کی شاعری کا کمال آظران کے اردو اشعار ہی میں ظاہر ہوا ہے۔ غالب کے متوجہ بالا اشعار کو ذہن میں رکھتے ہوئے، امریکی شاعر مارٹ فراسٹ کے وہ اشعار بھی یاد آتے ہیں، جن میں وہ کہتا ہے کہ ”ایک عقیدے کو کیوں چھوڑیں، صرف اس لیے کہ اب وہ صحیح نہیں رہا ہے۔ اس پر ایک مدت تھے رہو اور بلاشبہ



یہ پھر گج ہو جانے گا۔ کیوں کہ ایسا ہوتا ہے، زندگی میں بڑی جدلیاں جو اپنے خیال کے مطابق ہم دیکھتے ہیں، سچائیوں کے کبھی پسندیدہ اور کبھی غیر پسندیدہ ہو جانے کے سبب سے ہیں۔“

جدید مشقنی ایجادات اور ان کی لائی ہوئی تہذیب اگر سمندروں اور صحراؤں کو کھڑا پھینکنے کی جگہوں میں تبدیل کر دیں تو خود انسان کی اپنی ہستی بھی محدود ہو جائے گی۔ غالب نے مشقنی ایجادات کی تعریف کی تھی لیکن ان کی ترقی اپنے ساتھ عالم کبر ہلاکت کے خطرات بھی لائی ہے۔ یہ توقع ضرور ہے کہ آخری جاہی سے پہلے انسانی ذہن کوئی حل نکال لے گا۔ لیکن بات صرف مشقنی ایجادات کی نہیں بلکہ بقول غالب خود انسان کی تعمیر میں صورت فراموشی مضمر ہے۔ غالب کی شاعری کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ انسان کے اس حزن کو بچھانے ہوئے بھی زندگی کا حوصلہ برقرار رکھتی ہے۔ غم سے تو کسی صورت میں مفر نہیں کیوں کہ یہ انسان کے دل کے ساتھ ہے۔ غالب کس خوب صورتی سے کہتے ہیں کہ:

جنگی دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے

کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

غالب سے منسوب مصرع میں حاتی نے قوم کو ”با زمانہ بھاد“ کا پیغام دیا تھا اور غالب کے بعد اسی قوم کو اقبال نے ”با زمانہ متیز“ کا نازیباں لگایا۔ غالب کی شاعری میں دونوں کیفیتیں جتن ہیں لیکن وہ ہر بدلتے ہوئے موسم میں پھولوں کے کھلنے کا وہ منظر دیکھتے ہیں، جو غم و ذوق تماشا کا محرک بن جاتا ہے اور اسی لیے وہ آنکھ اور جلوہ گل کے حوالے سے انسانی تاریخ میں انسان مطلق کی لازوال بصیرت کا اعجاز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بکھٹے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں دا ہو جانا



# غالب اور غالب کی ایک غزل

غالب آج سے تقریباً دو سو سال پہلے عالم وجود میں آئے تھے۔ اس کے بارے میں خود ان کے الفاظ یہ تھے کہ ”ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے بحر عالم ابداع میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ابداع کے تہکار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ء کو روکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔“ غالب نے فکرِ نظم و نثر کو مشقت قرار دیا، لیکن جو سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، وہ متاعِ اہل نظر ہے۔ ان کی تخلیقی جہات کا ہر گوشہ مرکزِ توجہ رہا ہے۔ غالب کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اس کی مقدار اردو کے بیش تر شاعروں اور نثر نگاروں سے متعلق تحریروں سے زیادہ ہے۔ غالب اور اقبال ہمارے دو ایسے بڑے نابغہ روزگار ہیں، جو تنقید و تحقیق اور حسین و تعبیر کے محرکات فراہم کرتے رہے ہیں اور ان کی فکر و نظر کے بارے میں جستجو جاری ہے۔ اقبال سے ہماری نئی قویِ دعویٰ کی راہیں روشن ہوئیں اور غالب نے ہدایتی ہوئی تہذیبی اقدار کے درمیان نئے راستے نکالے۔ اس سلسلے میں ان کی اردو شاعری خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے کیوں کہ اس زمانے میں فارسی کے بنے بنائے و ادب کے مقابلے میں اردو اپنے اسالیبِ اظہار کی راہیں متعین کر رہی تھی۔ غالب، موسیٰ اور ذوق کے شاعرانہ اظہار کا فرق محض تفصیلات

کا فرق نہیں تھا، بلکہ ہم عصرانہ زندگی کے متعدد عوامل میں فکری اور تہذیبی استحقاقات کا فرق بھی تھا۔ غالب اردو کو عربی، فارسی، ہندی اور ترکی ان چار زبانوں کا مرکب جانتے تھے۔ لیکن انہیں یہ اندازہ بھی تھا کہ اب پانچویں زبان یعنی انگریزی بھی اس میں شامل ہوگئی ہے۔ بہر حال یہ معاملہ صرف بنیادی افعال یا وثیل الفاظ کا نہیں کہ اردو میں ان پانچ زبانوں کے علاوہ بھی کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ الفاظ جن تہذیبی سلسلوں سے وابستہ ہیں اور جن فکری تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں، انہیں کیسے والے نے مجموعی زندگی کی تفہیم کا کیسے وسیلہ بنایا اور ان سے کیا تخلیقی ست ثنائی کی ہے؟ غالب کی شاعری کی بڑائی یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی نہ صرف اس کی تازگی اور شادابی میں کمی نہیں آئی بلکہ اب بھی وہ جدید معلوم ہوتی ہے اور غالب کے کچھ اشعار بعض اہم شاعروں کے اشعار کی رنگوں میں گرم خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ غالب کی شاعری بھی خلا میں پروان نہیں چڑھی۔ اس کے پیچھے وسیع تہذیبی میراث تھی۔ لیکن غالب نے جدید زندگی کے مظاہر سے جو فراواں رابطہ قائم کیے تھے، اس سے ان کی شاعری میں فراخی اور آب و تاب آئی۔ غالب کی شاعری بلکہ ان کے تمام کمالات کا مجموعی جائزہ بھی ضروری ہے لیکن اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تخلیقات کے کسی ایک جزو پر توجہ صرف کی جائے۔ کبھی پہلوں اور ٹیوں کا حسن باغ کی مجموعی خوب صورتی سے توجہ ہٹا لیتا ہے اور کبھی باغ کی مجموعی خوب صورتی کا تاثر اس کا موقع نہیں دیتا کہ گل پتوں کی زیبائی پر نگاہِ تفتش ڈالیں۔ البتہ غالب کی شاعری کے جزو میں بھی ان کی مجموعی فکری اور تہذیبی بصیرت جھلکتی ہے، کیوں کہ وہ قلمروے میں دجلہ و کھائی دینے کو دیدہ و بنا کی صفت قرار دے سکے ہیں۔

انسان اپنے گرد و پیش میں تبدیلی کی آرزو مندی کا اظہار جن شکلوں میں کرتا رہا ہے ان میں ”پایے“ اردو کا ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ خود یہ آرزو مندی ایک ایسے تصور کو پیش کرتی ہے، جس کی متعدد جہتیں ہیں۔ اسے سابقہ صورت حال کو برقرار

غالب۔ نظر اور نگار

رکھنے کے خلاف ایک اشارہ بھی کہا جاسکتا ہے اور روایت سے تعلق رکھنے والی بعض ایسی خصوصیات کی جستجو سے بھی منسوب کیا جاسکتا ہے، جنہیں حالات کی روش نے شاہراہ یا معدوم کر دیا ہے۔ ایک جانب ”تجسس است و چنان ی بایست“ کی رزم آرائی ہے، تو دوسری جانب خیال کی وہ سیڑھیاں ہیں جو حسنی قدیم کی اثر آفریں سرشاری کی یاد دلاتی ہیں اور حال کی خرابیوں یا کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں زندگی کی طلی الحال یا غیر مہذل حالت قابل قبول نہیں ہوتی۔ غالب بھی حال سے غیر مطمئن، ایک ایسے شاعر تھے جو زندگی کی مجموعی صورت حال میں تبدیلی چاہتے تھے اور اضطراب وجود سے گزرتے ہوئے نئی کیفیات قننا کے خواہاں تھے۔

غالب کا عہد بڑے تضادات اور بڑی کشمکشوں کا عہد تھا۔ خود غالب ذاتی اعتبار سے بڑی ذہنی اور تہذیبی کشاکش سے گزرتے رہے ہیں۔ ان سب کی پرچمائیاں ان کے انکار و اشعار میں نظر آتی ہیں۔ انہیں بڑا کی اردو شاعری کے ذریعے ملی۔ (اگرچہ فارسی شاعری اور اردو نثر نگاری میں بھی غالب کا مرجع کم نہیں) لیکن وہ فارسی کا دم بھرتے رہے۔ فارسی میں بھی وہ اگرچہ خود سبک بندی کے شاعر ہیں لیکن اکثر ہندی گوئیوں کو فرومایہ سمجھتے (”قیل کون؟“ وہی فرید آباد کا کھتری پچ، میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا“ غالب) اور مقلد شاعرانِ ایران پر انکار کرتے رہے۔ فارسی شاعری میں برعکس تعلق وہ کہیں کہیں فارسی شعرا سے انضلیت کا دعویٰ بھی کرتے اور اس برصغیر سے اپنی برأت ظاہر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہو غالب عندیے از گلستانِ مجم

من ز غفلت طوطی ہند جاں ناسید مش

☆

غالب ز ہند نیست نوائی کہ ی کھلم

کوئی ز اصفہان و ہرات و قشم

لیکن اردو شاعری کو ”تجس من ست“ کہنے والے غالب نے نہ صرف مقلد

غالب سے رشتہ کو دھک بھاری بنانے کا اظہار کیا ہے بلکہ زیادہ عجیبہ طور پر اپنی ایک غزل کے حوالے سے نثر میں بھی کہتے ہیں کہ ”داد دینا کہ اگر رشتہ پایہ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی بجی صورت ہوگی یا کچھ اور۔“ پھر ”مہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہے کھائیں گے کیا“ کہنے والے غالب، ایران ہی نہیں، اپنا رشتہ خاک پاک توہان سے جوڑتے تھے۔ وہ اپنے سلجوقی اور افراسیابی ہونے پر ناز کرتے تھے۔ ہند کے فارسی شاعروں میں خسرو اور ابتدا بیدل کو ماننے والے غالب نے خسرو کی شہنشاہی سرزمین ہند سے کم سروکار رکھا اور دھک بھار ایچاندی بیدل کو پسند کیا۔ (آہنگ اسد میں نہیں جڑ تھمے بیدل۔ عالم ہر افسانہ مادود و ماچھ۔ لیکن آہنگ اسد میں بھی جو آہنگ غالب نہیں ہے، چند غزلوں کو چھوڑ کر وہ بیدل سے مختلف نظر آتے ہیں)۔ لیکن وہ اس کے سحر یا حلقہ اثر سے بھی لٹکے اور اردو کے مخصوص مزاج نے، ان کے اپنے مختلف تہذیبی عناصر سے ترکیب یافتہ مزاج اور ان کی گہری تجویزیاتی نظری کی آمیزش سے ایسے اشعار کی طرح ڈالی جو دنیا کے ادبی سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایرانی تہذیبی روایت کے عناصر موجود ہوتے ہوئے بھی، مثال کے طور پر ان کا مندرجہ ذیل شعر کہ:

نہاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی عالم ہو

وہی ہم ہیں قص ہے اور ماتم ہال و پر کا ہے

اپنے عصر کی ترجمانی کرتے ہوئے انسانی وجود کی غیر ختم مکمل کو جس ہوائے میں جڑ کر رہا ہے، اس میں اردویت کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن غالب جو مضطرب گلشن ناآفریدہ تھے، وجودی کرب کے دائرے سے بھی باہر نکلے ہیں اور ”جو ہے“ کے اضطراب کے ساتھ ”جو ہونا چاہیے“ کی آرزو کو بھی بڑی شاعرانہ قوت سے جڑھ کرتے ہیں۔

غالب کے کلام میں جو ہونا چاہیے کے سلسلے میں حدود اشعار مل جائیں گے۔ اس موضوع پر اشعار کے علاوہ ان کے اردو کلام میں تین غزلوں کی روایت بھی ”چاہیے“ ہے۔ ان تینوں میں سے ایک غزل ”عاشق، غلاب جلوہ جانا نہ چاہیے“ کے

غالب.. نظر اور نظارہ

سات اشعار (دیوان غالب کامل، مرتبہ کالی داس گپتا رخصا) میں سے صرف دو اشعار متداول دیوان میں ملتے ہیں اور دونوں ”معاہدہ ہندی“ نہیں۔ غالب کے اپنے انداز میں معاہدہ عشق کی سورہ لڑم صورتوں کو بیان کرتے ہیں۔ دوسری غزل ”چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے“ کے گیارہ اشعار میں سے صرف ایک شعر متداول دیوان میں چھوٹا ہے۔ اس غزل کے بیش تر اشعار وارداتِ دل اور حال سے نسبتاً زیادہ ربط رکھتے ہیں اور اسی مناسبت سے چاہیے، کی حدیں استوار ہوئی ہیں۔ مثلاً:

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے  
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے  
غافل ان مدِ طلعتوں کے واسطے  
چاہئے والا بھی اچھا چاہیے  
چاہتے ہیں غلب رویوں کو اسد  
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اس غزل میں اسد کے حلقے کے باوجود اردویت کا رنگ فراوان ہے اور چاہیے کے اردو میں مستعمل معنوں کی حدود سطحوں سے، جس طرح کام لیا گیا اور فائدہ اٹھایا گیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ غالب، اسد کے روپ میں بھی جمالِ اردو کے دل دادہ رہے تھے۔ اہت تیسری غزل ”وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے“ (دس اشعار میں سے صرف ایک شعر متداول دیوان میں چھوٹا ہے اور وہ بھی اشارہ کردہ شعر ہے) زیادہ عمومی نوعیت رکھتی ہے اور جہاں کسی صورت واقعہ یا کلیتہً حال کا بیان کیا گیا ہے، وہاں بھی نتیجے میں ایک ایسی تعظیم آگئی ہے، جو وسیع شاعرانہ نظر کا پتہ دیتی ہے اور آرزو ہندی کو سرحدِ امکان تک لے جاتی ہے۔ پہلی غزل کا زمانہ ۱۸۱۶ء دوسری غزل کا بعد از ۱۸۲۱ء اور تیسری غزل کا ۱۸۲۱ء دیا گیا (دیوان غالب کامل) ہے۔ غالب حلقے کا استعمال بقول کالی داس گپتا رخصا ۱۸۱۶ء میں شروع ہوا اور ان کے مطابق یہ شعر ”سے سے غرض نشاط...“ نسخہ شیرانی ۱۸۲۶ء کے متن میں موجود ہے اور

”ظاہر ہے کہ اسی سال یا اس سے کچھ پہلے کہا گیا ہوگا۔“ غالب نے اپنی ۱۸۵۰ء کی ایک غزل ”دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں“ کا مقطع (بہ تخلص غالب) حذف کر کے اور آخر میں دو شعر بشمول مقطع (بہ تخلص اسد) پڑھا کر نواب کلب علی خاں کو ۱۸۶۶ء میں بھیجی تھی۔ بہر حال تخلص کی یہ نفسیاتی رجعت اور مختلف غزلوں میں اسد یا غالب تخلص کے استعمال سے بعض نتائج کا استخراج، الگ مسائل ہیں۔ البتہ یہاں مذکورہ بالا تین غزلوں سے مماثلت رکھنے والی ایک قاری غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ:

بہ عشق از دو جہاں بے نیاز باید بود  
بہاز سوز حقیقت گداز باید بود  
بہ حبیب حوصلہ معجز نشاط باید رعایت  
بہ جان شکوہ تحافل طراز باید بود  
بہ خوں حیدر، دوق نگاہ متواس زیست  
شہید آں حڑ ہای دراز باید بود  
چہ بر ز راحت آزادی خوری غالب  
ترا بہ این ہمہ باہرگ و ساز باید بود

اس میں شک نہیں کہ یہ چارہی غزل قاری شاعری کی لطافت و رنگینی کے ساتھ غالب کے انداز بیان کی علامات بھی رکھتی ہے۔ لیکن غالب کے خیالات سے اردو شاعری میں جو توانائی آئی ہے اور خود اردو نے غالب کے شاعرانہ رنگ و آہنگ کو جس طرح متاثر کیا ہے، اس کے لیے غالب کی مذکورہ بالا غزلوں اور خصوصیت سے بیان کردہ تیسری غزل اردو کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

متداول دہان کے اس غزل کے پہلے شعر میں غالب نے روایتی طور پر رندی اور تھوٹی کو جمع نہیں کیا ہے، بلکہ اسے زندگی کی طلب اور تقاضا بتا دیا ہے۔ جس کی دلیل خود آفرغش نے صیبا کی ہے اور جس کی عدم دست یابی سے خود صیبا آفرغش

غالب - نظر اور طائر

میں کی آجاتی ہے۔ دوسرے مصرع میں آنکھ کے ساتھ ”بھوں“ کا لفظ بعض شاعرین غالب (حسرت، آسی) کو گراں ضرور گزرا ہے لیکن یہ نہ صرف قاری کے مقابلے میں طبیعت اردو کا لفظ ہے بلکہ یہ ضرورت و خواہش، شاعرانہ و غیر شاعرانہ اور حقیقت و واقعی و حقیقتِ حسنیٰ و قبیحہ کا ایسا اجتماع ہے کہ اس کے بغیر قبیلۂ حاجات کی طرح یہ معنویت نمایاں نہیں ہوتی۔ پورا شعر ملاحظہ ہو:

مہجر کے زہر سایہ خرابات چاہیے

بھوں پاس آنکھ قبیلۂ حاجات چاہیے

دوسرا شعر معاملاتِ عشق سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وسعت رکھتا ہے۔ نظیری

نے محبوب کی کسی دوسرے پر عاشق ہونے کی کیفیت کو کئی شعروں میں بیان کیا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:

چشمیں برہے میرود مژگانِ فتنائش مگر

ور سید داد آتشے جیرا من چاکش مگر

نمود غالب نے اس کی بیرونی میں لکھا تھا کہ:

ور مگر یہ از بس تازی رخ مانده برخائش مگر

دان سید سوزن از تیش بر خاک فتنائش مگر

برقے کہ جانہا سوختے دل از جفا سروش میں

شونے کہ خوبہا رخنے دست از متا پائش مگر

آن سید کز چشم جہان مانہ جان بودے نہان

ایک بہ جیرا من عیاں از روزن چاکش مگر

نظیری کی نہایت خوب صورت غزل کے مقابلے میں غالب کا شاعرانہ کمال،

نہایت کامیاب بیرونی میں نظر آتا ہے۔ لیکن اردو غزل کا شعر محبوب کے دوسرے پر

عاشق ہونے کی کیفیت کو متعدد تصویروں سے نمایاں نہیں کرتا بلکہ ستم کی عاشقانہ،

طیر عاشقانہ، کھلی معیشت کو سامنے رکھتے ہوئے مکافات کی خواہش کو آخر (اور یہ آخر سہمی



پہلو سے اہمیت رکھتا ہے) حقیقت کا آئینہ دکھاتا ہے۔ یہ دونوں پہلو ”چاہے“ کی روایت سے بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔

تیسرے شعر میں فلک، دل حسرت پرست اور ملائی ملاقات کلیدی الفاظ اور ترکیبیں ہیں لیکن ”دے داد“ کی صوتی کیفیت اور ”ہاں“ کی خلا قانہ حسرت سے شعر کے حسن و تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

غالب کے چوتھے شعر کے جائزے سے پہلے خود ان کا ایک فارسی شعر لائق مطالعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

خود را ہی بہ نقش طرازی علم کنم  
تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

فارسی شعر میں دولہہ بیان کی جلا سازی اور نقش طرازی کے باوجود اردو شعر کی فضا وسیع اور جدید ہے۔ مددگوں کے لیے مصوری سیکھنے کو تقریب بہر ملاقات بنانا، غالب کی معاشرت و ماحول سے زیادہ آج کے دور کی بات معلوم ہوتی ہے، جب مصنفین کو آزمائش ملاقات کے مواقع میسر ہیں اور توجہ صرف ایک تک محدود نہیں رہی ہے۔ الہذا اقبال جب کہتے ہیں کہ:

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی  
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

تو شاید یہ نے نوازی حصول الکافہ محبوب کے لیے نہیں بلکہ اس نے کی آواز مولانا روم کی اس نے سے مل جاتی ہے، جب انہوں نے کہا تھا کہ:

بشنو از نے چوں شکایت سے کند  
از ہدائی ہ شکایت سے کند  
کز نیست از مرا ہریدہ اند  
ور نظیرم مرد و زن نالیدہ اند

[اشعار کی یہ ادا اور متقن مولانا روم کے میوزیم میں مثنوی کے پہلے صفحے کے

غالب۔ نظر اور نگار

مطابق ہے جسے حال کے سر قویہ میں دیکھنے کا موقع ملا۔ لیکن ترکی میں اسے بہت پہلے موضوع بحث بنایا جا چکا ہے۔ مثلاً ندر (ترکی کا ایک شہر) کے اسماعیل حقی (۱۶۵۳-۱۷۲۵ء) کے خیال میں کلمہ شکایت پہلے آتا ہے اور دوسرا مصرع پہلے مصرع کی وضاحت کرتا ہے۔ کیوں کہ عاشقانِ حنائی اور عارفانِ ربانی کی زبان، زبانِ شکایت ہے، زبانِ شکایت نہیں۔ پہلے مصرع میں بھی شکایت کے معنی صرف شکایت کے نہیں باہمی بیان درد، اظہارِ احوال اور گفتگو ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں جاتی نے تصحیص کرتے ہوئے پہلے مصرع میں لفظ شکایت رکھ دیا جو صحیح نہیں ہے۔

غالب کا مذکورہ بالا شعر حسنِ محاذ سے قطع رکھتے ہوئے، تاریخِ معاشرت کے اُن ادوار کی یاد دلاتا ہے، جب فتونِ لطیفہ کا ارتقا لگا، انکسالاتِ حسن کی خاطر ہوا۔ اسے فتونِ لطیفہ کے آغاز کے متعدد نظریوں میں ایک نظریے کی حیثیت سے مانا جا رہا تھا۔ اس شعر کا جاسکا ہے۔ لیکن فتون کے ارتقا میں اس کی رنگ آرائی سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس شعر کی حد یہ تھا ان حوال سے وابستہ ہے جن سے اردو بولنے والا معاشرہ گزر رہا تھا۔

غالب کا نئے سے نکلنے کی جگہ اک گوند ہے خودی طلب کرتا اور اسے اس اصرار سے پیش کرتا کہ ”نئے سے غرض نکلا ہے کس دوسیا کو“ صرف انسانی نفسیات ہی نہیں سماجی زندگی کے اسنے گوشوں پر محیط ہے اور اتنی جہیں رکھتا ہے کہ تجزیے کی نظر حیران رہ جاتی ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے اسے مرزا بیگل کے مندرجہ ذیل شعر کا ”ترجمہ سا“ بنایا ہے:

مطمئن از نئے پرستی تو وفائی ہا نہ بود

یک دو ساغر آب و دہم گریہ مستانہ را

بیگل کے شعر میں زبانِ فارسی کی نفاست و معنی داری اور لفظی مناسبت کے کئی پہلو موجود ہیں۔ لیکن اس شعر کی مجموعی کیفیت نکلا ہے۔ سرمستی سے انکار کے باوجود بیگل کا گریہ، گریہ مستانہ ہے اور پھر اس گریہ مستانہ کو یک دو ساغر نے آب دی ہے۔ اس کے برخلاف غالب کا شعری تجربہ بھی مختلف ہے اور بے خودی کی نوعیت

بھی۔ فرض نکاح کو ”وہ کس روسیاء“ کہہ کر جس ہفت سے روک رہے ہیں، اس میں تلخی کی آمیزش ہی نہیں تلخی غالب نظر آتی ہے اور اس تلخی کے پیچھے جو ذاتی یا سماجی کوائف ہیں، ان تک صرف قیاس کی رسائی ہے۔ دراصل موضوع کی مشابہت کو پیش نظر رکھ کر بنیادی تجربے کی کیفیتوں کو نظر انداز کر دینا، ان ذاتی و انفرادی اور اجتماعی حالات کی پیدا کردہ صفات میں امتیاز نہ کرنا ہے، جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے الگ کرتی ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں الگ الگ کیفیتوں کو اپنے اظہار کے چادروں سے تقریباً مجزوء فن کی صورت دے دیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں کیفیتیں ایک دوسرے سے اتنی ہی الگ ہیں جیسے صبح کا دھندلا شام کے دھندلے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کبھی کبھی انسان کے بعض نہ بدلنے والے احساسات، مختلف ادوار اور مختلف تہذیبوں میں ایک جیسا جہازِ بیان اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر متوازی نقوش کی یہ کارفرمائی وہاں بھی دیکھی جاسکتی ہے، جہاں تہذیبی اقدار اور معاشرتی حالات میں مشابہت اور مماثلت ملتی ہے۔ دونوں صورتوں میں بعض اوقات بیان ہی نہیں، الفاظ بھی ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ایک کھینچے والے کو دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔

اس کے بعد کے شعر میں غالب نے لالہ دگل و سرین کے جدا جدا رنگوں سے جس طرح بہار کا اثبات چاہا ہے، اس کی حدیں عقیدے، فکر، علوم، فلسفے، لطیفیات، مابعد الطبیعیات اور جمالیات سے لے کر انتہائی تصورات تک وسیع ہیں۔ شاید غالب کے تخلیق کے لیے صوفیانہ تصورات محرک ثابت ہوئے ہوں لیکن ان کی علامت سازی کی خوبی یہ ہے کہ اسے زندگی کی نہایت وسیع صورتوں پر محاکے کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ آج کے دور میں انسان اور انسان کے درمیان ہی بیکارگی پیدا نہیں ہوتی ہے، سائنس اور انسانی علوم میں بھی مغایرت آگئی ہے۔ پھر ایک جانب نظام استبداد کو قائم رکھنے اور دوسری جانب نیا انسانی معاشرہ وجود میں لانے کی کوششیں ہیں۔ اس شعر کی ایک تعمیری صورت تو وہ ہے جب ماڈرنے ٹک نے ”سو پھولوں کو کھلنے دو“ کے اعلان

سے انتھائی غایت کو مدنظر رکھتے ہوئے قمری اور جہد جی آزادی کی ثروت آفرینی چاہی تھی۔ لیکن ایک صورت وہ بھی ہے جب زندگی خود اپنے رنگوں سے اپنی تصویر بناتی ہے اور انسانی تاریخ انسانیت کے رنگ نمایاں کرتے ہوئے مستقبل کی جانب ستر کرتی ہے۔ لیکن کیا ہم اپنے اپنے حدود میں شرفِ انسانیت کو معیار بناتے ہیں؟ تمام علوم کا اپنا اپنا دائرہ ہے لیکن ان سب کا مقصد انسان کی بہتری نہیں تو کچھ نہیں۔ نیچرل سائنس کی حاصل کردہ معلومات کو انسانی معاشرے کی ترقی کی راہیں روشن کرنا ہے۔ اسی طرح انسانی فطرت کے بارے میں جو آگہی حاصل ہوتی ہے اس کا مقصد بھی اپنے ماحول اور وصفِ زندگی کی پُرمانگی ہے۔ یہی حال تاریخ، ادب اور فنونِ لطیفہ کا ہے۔ جمالیاتی سرسرت بھی اس سے الگ نہیں۔ رابرٹ فراسٹ کے بقول شاعری کا سرسرت سے آغاز اور بصیرت پر اختتام ہوتا ہے۔ سارے علم و آگہی، جمالیاتی سرسرت اور جدوجہد کا قدر آفریں عنصر انسانی زندگی کی وحفی اور مادی ترقی یعنی بہار کا اثبات ہے۔ ساری دنیا جگہ کل کائنات میں انسان کو اس کے ظلم اور جمل کے باوجود مذہب، فلسفہ اور علوم نے مرکزی حیثیت دی ہے۔ میکس پلانک (Max Planck) نے کہا تھا کہ "سائنس ایک وحدت تھی ہے۔ اس کی مختلف شعبوں میں تقسیم بھیجے اشیاء سے زیادہ انسانی علم کی محدود صلاحیت کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ درحقیقت ایک زنجیر مسلسل ہے جو ٹوکس اور کیمسٹری سے لے کر بیالوجی اور ایتھراپالوجی سے گزرتی ہوئی سماجی علوم کی جانب جاتی ہے اور اس سلسلے کو بلا سوچے سمجھے ہی توڑا جاسکتا ہے۔" آج ہمیں سماجی علوم اور دیگر علوم میں جو بند نظر آ رہا ہے، وہ حقیقتاً اس زنجیر کے ٹوڑ دینے کی گواہی دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ جس طرح رنگ لالہ و گل سرین میں فرق ہے، اسی طرح علم و آگہی کے مختلف طریقے بھی اپنی اپنی الگ الگ خصوصیات رکھتے ہیں اور ان خصوصیتوں کی وجہ سے ان کی شناخت اور ترقی ہوتی ہے۔ ان سب میں جو بنیادی وحدت ہے وہ تمام کشتکوں اور محاسنوں کے باوجود بلکہ ان کے درمیان جلد داری، قوی اور بین الاقوامی سرحدوں سے گزرتے ہوئے انسان کی آفاقی جہات کی

دریافت ہے۔ غالبؔ کے شعر کو دھندان و آگہی اور تصوف و علوم کے اس مشترک ہدف کا اشارہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد غالبؔ کے قلم بند دو شعر (اس سے پہلے کے شعر کو قطعے سے الگ حیثیت کا حامل سمجھا جانا چاہیے) تصوف اور حقیقتات تصوف کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صانع قزوینی اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ جو دروازے پر دستک دیتا رہے گا، دروازہ اس کے لیے کھول دیا جائے گا۔ اس کے برخلاف راہب بھری کا قول تھا کہ دروازہ تو کبھی بند ہی نہیں ہوا۔ ترکی کے مشہور صوفی حاجی بکاش فرماتے تھے کہ جو کچھ رکھتا ہے، اس کے لیے ایک نشان کافی ہے اور جسے پر دانیوں اس کے لیے ہزار تشریحات بھی ناکافی ہیں۔ بھیسہ شاہ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی۔ غالبؔ ہرگز صوفی نہیں تھے لیکن ان کے کلام میں ہار ہار اصطلاحات تصوف سے کام لیا گیا ہے۔ یہ کلام، کیفیات تصوف نہیں تو ایسے تصورات تصوف سے ضرور ملو ہے جو پوری مسلم تہذیب کا حصہ بن گئے تھے اور جن سے تاریخ کے ایک بڑے حصے میں قدر انسانیات نمایاں ہوئی تھی۔ مسلم تاریخ میں شریعت اور طریقت کی آویزش، مطالعے کا دلچسپ موضوع ہے۔ اصحاب سکر صوفیاء سے کچھ ایسے اقوال بھی منسوب کیے جاتے رہے ہیں جن پر اہل شریعت اور خود اصحاب سکر، صوفیوں کو اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ لیکن سکر شاید مقامات تصوف میں ایک لازمی کیفیت ہے۔ برگساں نے دھندان کو برتر فہم سے تعبیر کیا تھا اور صوفی جذبہ عشق کو ہمیشہ عقل پر ترجیح دیتے رہے ہیں۔ (اقبال بھی صوفی نہیں تھے لیکن کہتے ہیں کہ ”ہر دو بھولے رواں، ہر دو امیر کارواں۔ عقل عجلہ می برد، عشق بروکشاش کشاش“)۔ غلو ان کے چہر معنوی مولانا روم جذبے کی شہرہ انگیز کیفیت سے گزرے تھے اور ان کے بعض اشعار پر ظاہر ہیں لگا ہیں معترض ہو سکتی ہیں۔ لیکن مولانا روم کا تجزیہ بڑا وسیع اور مکمل تھا۔ کلیات شخص تہذیبی کے بعد انھوں نے شہوی بھی لکھی تھی۔ لیکن عشق شہرہ انگیز کا تجربہ بھی ضروری تھا۔ وہ کہتے جہاں کہ:

حاصل حرمؔؔ رخسارِ نیست  
خام بدمؔؔ پختہ شدہؔؔ سوختم

پھر شریعت، طریقت اور حقیقت کو یک جا کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

”شریعت چھو شخصیت وہی نہاید و بے ایک شمع بدست آوری راہ رفتہ نشود و چوں در راہ آمدی آن رفتن تو طریقت و چوں رسیدی بمقصود آن حقیقت۔“

غالب نے سکر اور محو کی دو کیفیتوں کو متوازی طور پر بڑی خوبی سے پیش کیا، بلکہ انھیں قدر انسانیت بتا دیا ہے۔ غالب کی شاعری غور و فکر کی شاعری ہے۔ برٹینڈرسل اپنی کتاب *Mysticism and Logic* کی ابتدا ہی میں لکھتا ہے کہ:

”ما بعد الطبیعیات یا دنیا کو بہ حقیقت کل خیال کے ذریعے تصور کرنے کا ارتقا شروع سے دو مختلف تحریک انگیز انسانی قوتوں سے ہوا۔ ایک جو انسان کو تجربے سے ماوراء فہم باطن (Mysticism) کی جانب لے جاتی ہے اور دوسری جس کا ڈرغ سائنس کی طرف ہے۔ کچھ لوگوں کو صرف ایک کے ذریعے اور کچھ کو صرف دوسری کے ذریعے بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن فلسفی جو سب سے بڑے ہیں وہ سائنس اور فہم باطن دونوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔“ غالب ایک متضاد فلسفی نہ کسی لیکن ان کی شاعری میں فلسفیانہ افکار کی اثر آرائی ملتی ہے۔ وہ جدید دور میں سائنس ترقی کی ضرورت بھی محسوس کرتے تھے۔ ان کا میدان، عمل کا میدان نہ تھا لیکن ان کی شاعری میں مثبت افکار اور انسانی جدوجہد کے آثار ملتے ہیں۔ برٹینڈرسل کے مذکورہ بالا خیالات، فہم باطن کی تشریح بڑی حد تک مغربی افکار، عقائد اور اعمال کی روشنی میں کرتے ہیں اور فلسفیانہ بڑائی کا تصور بھی انتظامی فکر کی دین ہے۔ لیکن ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ مشرق میں بھی اکثر مصوفیانہ افکار کی ترقی اس وقت زیادہ ہوئی ہے، جب عمل کے راستے مسدود نظر آتے ہیں اور معاشرہ زوال کے دور سے گزر رہا ہوتا ہے۔ مولانا روم کے صوفیانہ افکار کی حرکت انگیزی کو الگ درجہ دیا جاسکتا ہے کہ نئی کمال نے امت حامدی تان چار کے اس سوال کا کہ ”استاد ہم دیا نا کے درد ازل تک کیسے گلے“ جواب دیا تھا کہ ”چاند کساتے اور شہوی پڑھتے ہوئے۔“ البتہ یہاں ترکی کے ایک ہم نام (ہم شخص کسی) شاعر شیخ غالب کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

شیخ غالبؔ (محمد بن مصطفیٰ رشید) غالبؔ سے چالیس سال پہلے اختہول (۱۷۹۸ء-۱۷۵۷ء) میں پیدا ہوئے۔ شیخ ان کے نام کا حصہ نہیں تھا بلکہ وہ جمال الدین رومی کی طریقت سے منسوب قلاط کے مولوی خانے کے شیخ کے مقام پر قائم ہونے کی وجہ سے شیخ غالبؔ کہلائے۔ غالبؔ کے زمانے میں سلطنتِ مغلیہ زوال کی آخری حدوں تک پہنچ کر ختم ہو چکی تھی۔ شیخ غالبؔ کے زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ زوال کے دور میں داخل ہوئی تھی لیکن اسے ختم ہونے میں وقت لگا اور اس کا خاتمہ بھی سلطنتِ مغلیہ کی طرح نہیں ہوا۔ لیکن اس زوال کی جھلک شیخ غالبؔ کے کلام میں مل جاتی ہے۔ غالبؔ کے شعر:

دارغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خوش ہے

پر بہت خوش ہونے والے کہ ۱۸۵۷ء کا حادثہ قلعہ بعد میں رونما ہوا اور اس کا غالبؔ کے اس شعر سے کوئی تعلق نہیں، زیادہ خوش نہ ہوں کہ کسی دور رس فکر کے لیے واقعہ کا رونما ہونا ضروری نہیں، وہ آنے والے دنوں کی پرچمائیاں دیکھ سکتی ہے۔ پھر اس شعر میں تو غالبؔ شیخ کے بچنے کی کیفیت کے ساتھ اس کے رہ جانے کی بات بھی کر رہے ہیں۔

شیخ غالبؔ کا شہر ترکی دیوان اویات کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں بھی غالبؔ کی طرح کلمہ ”آتش“ علامتی مفہوم رکھتا اور بار بار آتا ہے۔ جس طرح غالبؔ نے زہرِ غم کو رگ و پے میں اترتا محسوس کیا تھا، اسی طرح شیخ غالبؔ نے کہا تھا کہ ”جو بویا ہے وہ دانتِ شرر ہیں، جو کاٹا ہے، وہ پارہ پارہ قلب ہیں۔“ غالبؔ کو غرقِ دریا ہونے کی حسرت تھی اور شبِ تار و حجرِ طوقاں خیر میں انھوں نے ناخدا کو سوتے پایا تھا۔ ”مسکندہ فکر کشی، ناخدا نکشت۔“ شیخ غالبؔ نے کہا تھا کہ ”میں نہیں جانتا کہ کیا میں غریبِ نیک حسرتِ غالبؔ رسوا ہوں اور پھر اضافہ کیا تھا ”بلا موع آور گردابِ حیرت ناخدا نابود۔“ دونوں کا دربار سے تعلق تھا لیکن شیخ غالبؔ تھری طور پر ہی

غالب... نظر اور نگار

نہیں ہے اعتبار مسلک بھی صوفی تھے۔ لیکن غالب نے سرچشمہ تصوف سے فیض یاب ہوتے ہوئے بھی دنیا اور لذات دنیا سے مستحکم تعلق قائم رکھا تھا۔ لیکن دونوں کی شاعری میں انسانی بڑائی کا احساس ملتا ہے۔ قطعہ بند اشعار میں بھی قدر ذات قدر انسانیت بنی ہے۔ دونوں نے ہار ہار انسان کی بڑائی کو موضوع بنایا ہے۔ فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں احتجاج و شکوہ اور شیخ غالب کے کلام میں تسلیم کے عناصر زیادہ ہیں۔ غالب کو انسان کے سمجھو ملانک ہونے کے بعد اس کی موجودہ حالت کا شکوہ تھا۔ لیکن شیخ غالب نے کہا تھا کہ ”اے دل تو اس رنج سے بے غم کیوں ہے؟ اپنی ذات کا خوش نگر ہو، حاصل عالم تو ہی ہے، مردم دیدہ کائنات جو ہے وہ تو ہے۔“ انسانی بڑائی، انسان دوستی، باطنی احساسات کی پہچان اور وسیع الشربہ کے ان تصورات ہی کی وجہ سے ترکی کے مشہور مصنف و مفکر ضیا گوکالپ نے کہا تھا کہ صوفی شاعروں نے صدیوں پہلے جن نظریات کو پیش کیا تھا وہ اب برکھ، کائنات، ولیم جیس (کئی نام گھمائے ہیں) کے ناموں سے منسوب ہیں۔“ غالب اور شیخ غالب دونوں نے سب سے ذات ہونے کا جو پیغام دیا ہے، اس کی بنیاد ان ہی صوفیانہ تصورات پر قائم ہے۔ غالب کی ”چاہیے“ روایت والی دوسری غزل میں بھی کم از کم ایک شعر ایسا ہے، جس کی مناسبت عالم فطرت سے گزر کر لطیفہ فیہی سے قائم ہوتی ہے، لیکن مرکز نظر انسان رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

چاک مت کر جمیب بے ایام گل

کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

غالب نے صوفیانہ روایت کی بطنی ہوئی انسان دوستی، عالم انسانی کی وحدت اور وسیع الشربہ کے تصورات کو قبول کیا، لیکن اپنی ذات اور شاعرانہ خصوصیت دونوں میں وہ ان تضادات کے شاہد بھی رہے ہیں جو گرد و غبار کی زندگی پر اثر ڈالتے اور اسے مستحکم کی غیبتیں عطا کرتے ہیں۔

غالب کی اس غزل کا آخری شعر:

نشوونما ہے اہل سے غالب فردوس کو

غاسوثی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے



صوفیانہ تصور عدم، اٹھائی مزارع خاموشی اور مابعد جدیدیت کی زبانوں اور ادبی اسالیب اظہار کی نامکاملانہ مکالمات کے لیے شاعرانہ دلیل فراہم کرتا ہے۔ نیستی سے ہستی کا سفر، اٹھائی عمل جو دلوں کی طرح خاموشی سے پردان چڑھتا اور یکایک قائم شدہ صورت حال کو بدل دیتا ہے، مابعد جدیدیت کا ایک انداز فکر جو آرطیس (Orphèus) کے کئے ہوئے سر سے ادا ہونے والے نکلے کو مابعد جدید اظہار کا اشارہ بناتا ہے۔ (ایضاب حسن (Ihab Hasan) ) ایک ایک تھوڑاتی اوصاف کے حامل ہیں۔ غالب کا شعر ان سب سے جدا مگر ان میں اس لحاظ سے شامل ہے کہ وہ ایسی شاعرانہ منطق سے کام لیتا ہے جو ہدایتی خصوصیت رکھتی ہے۔ جہاں خاموشی اور بات کا تضاد خاموشی کو بنیادی حیثیت سے پیش کرتا ہے، وہاں اصل اور فروغ کے فرق کے باوجود جو بات ”چاہیے“ کا کھڑا اصل اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کھڑا جس حسن ادا اور طلب کشادہ سے پیش کیا گیا ہے، اس سے درحقیقت معنی کی راہوں میں کئی نشانات منور ہوتے ہیں اور کئی پہلو نکلتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ”بات نکلتے“ اور ”بات چاہیے“ کے نکولے جس طرح اردویت کے مزاج میں داخل کر اظہار کی دھنوں تک پہنچاتے ہیں، اسے اس غزل اور خود غالب کے کلام کی معنی طرازی کا کرشمہ کہہ سکتے ہیں۔



## غالب اور نقشِ نو آئین

غالب ایک ایسے شاعر اور دانش ور تھے، جن کی ذات میں محورِ افکاری، ترقی خواہی اور پیشِ بنی کی صفات ایک خلا کا نہ کلیت کے ساتھ مجتمع ہو گئی تھیں۔ ان کے طرزِ فکر سے سرسبز اور حالی ہی متاثر نہیں ہوئے، اقبال اور فیض تک اس کا سلسلہ پہنچا ہے۔ ان کے علاوہ مولوی عبدالحق، یلدرم، یگانہ اور نیاز اپنے اپنے طور پر اس چشمِ فیض سے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ یگانہ نے غالبِ فہنی اور نیاز نے غالب کی قدر و شناسی کے سلسلے میں ایک حد تک کج بنی کا رویہ اختیار کیا لیکن غالب کے اثر سے دونوں نہ بچ سکے۔ غالب کی روایت اور غالب کی ماضیت پر مبنی دونوں نے اربابِ فکر و فکر کو اظہار کے نئے گوشوں کی جانب مائل کیا ہے۔ پھر ان کی ذہنی بے باکتی اور بتِ فہنی کی الگ جہات ہیں کہ یگانہ کی غالبِ فہنی بھی، اسی سمت میں ایک قدم بھی جاسکتی ہے۔ غالب کی ایک ادبی بت کی طرح پرستش کرنا، خود اُن کی وسعتِ نظری کی توہین ہے اور غالب کی ذات کا محاورہ بن جانا، اُن کی فکری اساس سے محرومی کی دلیل ہے۔ لیکن غالب کی فکر کو نئی جہتوں پر منطبق کیا جاسکتا ہے اور ان کے کلام میں نئی صداقتوں کی تلاش سے قبی بصیرت و ادراک میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ غالب نے زندگی کی تبدیلیوں کے جلوہ ہزار شیوہ کو مد نظر رکھا ہے لیکن کلاسیکی روایات کی تکمیل بھی کی ہے۔ ہندو گزشتہ کی مناعانہ ور

و بہت ان کے کلام میں رہی یہی ہے۔ نظیری، بیڈل، غہور کی اور دوسرے فارسی شاعروں سے غالب نے بہ کثرت استفادہ کیا ہے۔ وہ بعض کے کائل رہے ہیں اور بعض کے حلقہ اثر سے نکلے ہیں لیکن فارسیت ان کی شاعری کا ایک اہم رخ ہی ہے۔ اردو شاعروں میں میر اور نظیر اکبر آبادی کے اثرات ہی نہیں، دبستان کھنڈ کے نمائندوں یعنی آفتل اور ناسخ کے متاثریات بھی غالب کے کلام میں بڑی آسانی سے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ آفتل کے کلام میں قلندرانہ وضع کے ساتھ ساتھ جس مردانہ دلولے کی نمود ملتی ہے، غالب کی شاعری بھی ان کی نظیروں سے بڑھ کر حرکت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوصاف جمال کے احساس اور دلولہ و تحریک میں آفتل کی شاعری الگ مقام رکھتی ہے۔ ناسخ کی شاعری فنی طور پر نعت کیر لیکن تخلیقی طور پر نسبتاً آزاد معاشرے میں، جس مضمون آفرینی کو راہ دیتی ہے، اس کے صحیح تجربے کی بڑی ضرورت ہے۔ غالب کی شاعری ایک متوازی راہ پر گامزن ہے لیکن ناسخ کی مضمون آفرینی، غالب کے کلام میں زندگی کی فکر تازہ سے مملو ہو کر دو اکسہ بن گئی ہے۔ دراصل ماضی کے تہذیبی عناصر کی گرفت اور حال کی تہذیبی ماہیت کے استخراج کے ساتھ زندگی کی فکر تازہ ہی وہ صفت ہے جس نے غالب کی بیدار و مستعد نظر کو مستقبل کی پیکر تراشی کا وصف بخشا ہے۔

غالب کے فکر تازہ کی ایک خصوصیت آزاد خیالی ہے۔ چنانچہ یگانہ غالب دشمنی کے باوجود اور نیاز ایک حد تک غالب کی عظمت کے ہوائستہ کائل رہے اور آزاد خیالی کا پرچم بلند رکھا۔ البتہ غالب اور سرسید کی آزاد خیالی کے دائرے کو نیاز نے محدود کر دیا ہے۔ لیکن نیاز ایک حد تک غالب کے گھٹن ہائے رنگ رنگ کے معترف ہوتے ہوئے بھی، اپنی عقائد و ماساحتی نئے سبب، غالب کے بارے میں کم تر بھی کا سلوک رکھتے ہوئے، اس کی آزاد خیالی اور فکری جسارت کے خوشہ چمن رہے ہیں۔ لیکن اس فکر تازہ کی دوسری اور زیادہ اہم خصوصیت، حال کے واسطے سے مستقبل کا شعور ہے۔ چنانچہ بعد کے ادیبوں اور شاعروں ہی نے انھیں، بڑی ادبی تحریکوں نے بھی غالب سے آکسپ لھر کیا ہے۔ ملی گزرتہ تحریک کے بعد اردو ادب کی دوسری بڑی فعالیت یعنی ترقی پسند تحریک

عالم ... نظر اور نگار

پر عالم کے اثرات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جہاں بعض کی شہوتوں کا چراغ بجھا دیا، وہاں اس سے عالم کی روشنی چیز تر ہوگئی۔ علی گڑھ تحریک کی فکری عبودیت اور ترقی پسند تحریک میں فکری بناوت کی مستقبل آفریں غایت کا سلسلہ انکار عالم سے جاملتا ہے۔ یہی غایت ہے جو ”شاعر کے انہام“ کی بجائے معاشرے کی سرانجامی سے سروکار رکھتی ہے اور اس میں انفرادی کاوشیں اجتماعی عبود کا قتل اہا کرکرتی نظر آتی ہیں۔ عالم نے یوں ہی نہیں کہا تھا کہ:

آہستہ آہستہ ہم ہر سرخارے پہ خون دل

کانوں باطنی صحرا نوشہ ایم

ترقی پسند تحریک سے پہلے اسے ترقی پسندانہ انکار کا منظرہ کہا جاسکتا ہے اور اس منظرہ کی متعدد خصوصیتیں خود عالم کے کلام میں اور اس کے بعد آنے والوں کے اقوال و اعمال میں نمایاں ہوتی رہی ہیں۔ فیض نے ”ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے“ کہہ کر جدوجہد کے جس ختم نہ ہونے والے سلسلے کا پتہ دیا تھا، عالم کا مندرجہ ذیل شعر بھی گویا اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

خارہا از اثر گرمی و قندام سوخت

منہم بر قدم راہ رواست مرا

عالم انسانی کم زور یوں اور اپنے عہد کے تضادات کی پیدا کردہ خطاؤں سے مبرا نہ تھے۔ ایک طرف ان کے آدرش کی بلندی تھی اور دوسری طرف وہ انسانی پستیوں جنہیں جینے کے لیے انہیں اختیار کرنا پڑا تھا۔ دعوے کے باوجود وہ شیخہ منصور سے بہت دور تھے۔ طبعیت کی دیرینہ آزادی کے ساتھ آسائش کی گرفتاری انہیں پسند تھی اور ذوق عبود و خود انہیں آتش کے ”ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا“ کے روپنے سے بچانہ رکھتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ”گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی“ کہہ سکتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ ان کے خیال کی دنیا بڑی وسیع تھی بلکہ وہ اس احساس کے ساتھ کہ:

عالم سوختہ جاں را چہ بہ گفتار آری

بہ دیارے کہ عائد نظیری ز قہقہ

یہ شکایت بھی رکھتے تھے کہ:

وحشت پہ بھری عرصہ آفاق ٹھک ہے  
دہلا زمین کو عرقِ افعال ہے  
پھر وہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:  
نہ کنی چاہو لب خشک مسلمانے را  
اسے پرتسا بچگاں کردہ ی تاب سبیل  
بھی نہیں اس وسیع آشوب کے بالقابل انھیں اپنی ذات میں کمی اور ناکافی کا  
اعدارہ بھی تھا۔ وہ کہتے ہیں:

جی چلے فوقِ فنا کی ناکھائی پہ نہ کیوں  
ہم نہیں جلتے لہس ہر چند آتش بار ہے

دراصل عمل سے زیادہ حقائق کے وسیع نگارے اور انسانی آدرش سے گہری  
بیچنگی سے ان کی شاعری نے بڑائی پائی ہے۔ ان کے دل میں اعلیٰ انسانی اقدار کے لیے  
جو غیر معمولی تڑپ تھی، وہ بار بار شعری ٹکڑوں میں ظاہر ہوئی ہے۔ ان کے خیال کا دائرہ  
اتنا وسیع تھا کہ بعض اوقات اعداد ان کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ پھر غصہ و صحت کی جگہ ایک  
بھید غلڑ اور ٹانڈہ روزگار کی طرح ان کے بیان میں مسخیل کے لیے وہ قوت و حرکت  
ہے، جو کہیں کہیں پائی جانے والی کم عقلی اور نارسائی کی حدوں میں بھی اپنا نقش مستحکم  
کرتی ہے۔ چنانچہ جہاں بعض لکھنے والے اپنے زمانے ہی میں قصہ پارینہ بن جاتے  
ہیں اور کوئی نئی ادبی تحریک ان کو طاق نہیں نہ کسی کتب خانے کی المادی کی نصبت بنا  
دیتی ہے وہاں ہر آنے والا دن غالب کی شاعرانہ عظمت کو زیادہ روشن کر رہا ہے۔ ان  
کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کسی سالانہ عرس کی ضرورت نہیں بلکہ زندگی کی نئی صورتیں ان  
کی فکر کو زندہ رکھتی ہیں اور نئی تحریکیں ان سے توانائی پاتی ہیں۔ غالب کے کچھ کم مشہور  
اشعار بھی ان کے فکری جہات کی بڑی اچھی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار  
میں شاعری اتنا صرف ذاتی نہیں بلکہ مسخیل کی قوتوں کی اہمیت ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

ایں اہ کہ شویہ رہن لکھائے بہاری  
از دامن ما ہدوش آسودہ نصبت

زیں نقش نو آئیں کہ براہین غائب  
کافد ہر تن وقت سپاس قلمیے

وقت کے ساتھ لفظوں کے معنی ضرور بدل جاتے ہیں لیکن یہ معانی شاعری میں جن صورتوں کی چھو، دکھاتے ہیں، ان کا تاریخی ضرورتوں اور عصری تقاضوں کی روشنی میں جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ برصغیر میں غالب کے دور کے سیاسی شعور میں جمہوریت کا مفہوم نامعروف تھا۔ لیکن جدید و قدیم کی آویزش ایک ذمہ حقیقت کی حیثیت رکھتی تھی اور آ کے پڑھتی ہوئی زندگی کے سائنسی اور عقلی رویوں کا خیر مقدم پیش قدمی کا انداز فکر کہا جاسکتا ہے۔ پرنگانی، فرانسیسی اور انگریز جو نئے صنعتی دور کے ترہان تھے، برصغیر میں سیاسی بالادستی کے لیے کوشاں تھے اور ان میں انگریزوں کو نہ صرف حریف پارٹی قوتوں، بلکہ جاگیردارانہ معاشرے کی مقامی طاقتوں پر بھی فتح حاصل ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ انگریزوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے، مختلف سطحوں پر خود مقامی جاگیردارانہ اقتضال سے مخالفت کر لی بلکہ نئے جاگیردارانہ طریقوں اور نئے زمیندارانہ نظام کی بنیاد رکھی۔ اس کے باوجود ان کی آمد سے برصغیر کی خود کفیل معاشی زندگی کا ظلم ضرور ہوتا اور نئے سائنسی ذرائع نے نئے احساسات و خیالات کے لیے زمین ہموار کی۔ لیکن انگریزوں کے واسطے سے جو نظام فکر آیا تھا، اس میں بھی قدامت کے اجزا موجود تھے۔ شاییت انگلستان میں ایک منظم ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ حالاں کہ انقلاب فرانس جس نے ساری دنیا کے فکری محوروں کو بدلا تھا، ۱۷۸۹ء میں رونما ہو چکا تھا۔ لیکن برصغیر کی تہذیب و معاشرت پر فرانسیسی اثرات ابھی تک تحقیق طلب رہے ہیں۔ البتہ خود انگلستان میں بعض رومانی شاعروں نے انقلاب فرانس کے گمن گئے تھے اور کچھ نے اس کے سیاسی مضمرات سے ڈر کر اس کی حمایت سے بازگشت بھی اختیار کی تھی۔ پھر خود فرانس میں نپولین بونا پارٹ نے ۱۸۰۴ء میں اس انقلاب کو روکیا اور امپراطور (Emperor) کی حیثیت حاصل کر لی۔ لیکن انقلاب فرانس نے جو اثرات چھوڑے، وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ ہائرن نے کہا تھا کہ ”مجھے ایک جمہوریت دو، شاہوں کے زمانے ختم

ہو رہے ہیں۔“ اس نے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ ”آخر میں عوام کو فتح حاصل ہوگی۔“ اس کے برخلاف برک (Burke) نے انگلستان میں شایستگی کی حمایت کی اور انقلاب فرانس کے بارے میں اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے، اس موضوع پر اپنی ۱۷۹۰ء میں شائع ہونے والی کتاب میں نہ صرف شوالیت (Chivalry) کے مہم کے خاتمے پر افسوس کا اظہار کیا بلکہ اس افسوس کے ساتھ ساتھ دور کو روشنی اور عقل کی نئی فتح کرنے والی سلطنت سے تعبیر کیا۔ غالب نے جہاں نئے نئے انقلاب کا ماتم کیا اور دہلی کے دژ ذلّت خاک کے مسلمانوں کے محض خوں ہونے کا اظہار کیا، وہاں انگریزوں اور انگریزوں کی سلطنت کی تعریف کی، ملکہ وکٹوریہ اور انگریز حکام کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے۔ لیکن ان کے کلام میں قدیم کے خاتمے کے احساس اور جدید کے آنیپہلو کے شعور کے ساتھ ساتھ روشنی اور عقل کی فتح مندی یا منور افکری اور عقل پسندی کی نظریاتی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ان کا بنیادی موضوع انسان کی کھنکھس حیات ہے۔

غالب کا دائرہ فکر آزاد خیالی کے نام پر پیش کی جانے والی بعض مستغنی کی تحریروں سے، فنی اور فکری طور پر بدرجہا بلند ہے۔ فنی طور پر اس لیے کہ قدیم و جدید کی آویزش اور تضاد کو احساس کی متنوع کیفیتوں اور معنی کی متحدہ جہوں کے ساتھ غالب نے جن شاعرانہ نیکروں میں ڈھالا ہے، دوسروں کے یہاں اس کا شائبہ بھی نہیں۔ فکری طور پر اس لحاظ سے کہ غالب کا شعور محدود نہیں۔ وہ صرف ایک گوشہ آزادی کو نہیں پیش کرتے، بلکہ ان کا شاعرانہ اور ادبی حسیات اور روشنی کی وسعتوں پر محیط ہے۔ یہاں تک کہ وہ روش غامض کا دعویٰ کرنے والے اہل غم کے یہاں پائنتی رسم و رسم عام کے شاکی ہیں یعنی غالب کے نزدیک ان کی ذاتی بناوت بنیادی نہیں بلکہ وہ انفرادی کے پامال ماستوں پر گامزن ہیں، اس کے برخلاف غالب نے صرف زائد تک نظری ہی کو نہیں، انسانی حوصلے کے مقابلے میں کائنات کی عقل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ پھر ان کی یہ فکر ایسی شاعرانہ شہادتوں میں ظاہر ہوئی ہے کہ ان کی تعبیر محض مجرد تصورات کے اظہار سے نہیں کی جاسکتی بلکہ ان کی قوسہ عقل اور وسیع تصور کے ساتھ ساتھ ان میں احساس

غالب... نظر اور طائر

دستی کے سنے جہاں آباد نظر آتے ہیں۔ انسانی آرزوؤں میں مزاج، معاشرتی اور کائناتی مصداقات کا اور اک غالب کو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ:

کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائے  
بے تکلف اے شرار جنت کیا ہو جائے  
بیضہ آسا تک ہال د پر ہے یہ کچھ قفس  
از سر نو زندگی ہو کر رہا ہو جائے

غالب کا دور ایک ایسی تاریخی اور تہذیبی کشمکش کا دور تھا، جس کی مشابہت برصغیر کی تاریخ میں پہلے نہیں ملتی تھی۔ دراصل تاریخ میں ہر واقعہ اپنی اقوامی نوعیت رکھتا ہے اور ان معنوں میں تاریخ کبھی اپنے آپ کو نہیں دہرائی، صرف اس کی ظاہری مماثلتوں کی بنا پر تکرار کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن غالب کے دور کی یہ ظاہری مماثلت بھی پہلے موجود نہیں تھی، اس لیے اکثر نظریں رخصت حقائق کی گرفت سے قاصر رہیں۔ صدیوں کی قائم تہذیب، جس کے رنگوں سے فنون لطیفہ کے اقدار بحال کی ترتیب ہوئی تھی، ایسے اختصار کا فکار تھی کہ اس کا ذوال اگر عام نظروں سے غفلت رہے تو رہے، حساس آئینوں میں ضرور دیکھا جاسکتا تھا۔ غالب کی شاعری بھی ایک ایسا ہی آئینہ ہے۔ لیکن یہ آئینہ صرف انعکاسی نہیں۔ اس آئینے میں غالب کی فکر کی دور بینی بھی بیست تھی۔ کار گزارانہ تحقیق یہ پتہ چلاتے رہیں کہ ”حکمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے“ کی کیفیات کو پیش کرنے والی غزل ۱۸۵۷ء سے کتنے پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن غالب ”اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی ٹوٹ رہی ہے“ کہہ کر یہ بتا دیتے ہیں کہ ان کی نظر دیوار کی تحریر پڑھنا جانتی تھی۔ لیکن ان کی پیش میں ذکاوت جہاں قائم شدہ تہذیبی صفات سے جذباتی تعلق رکھتے ہوئے بھی، اس کے خارجی دباؤ اور اندرونی اختصار کے ہاتھوں پارہ پارہ ہونے کا مظہر دیکھ رہی تھی، وہاں وہ اس مظہر کے پیچھے نئے امکانات کا اندازہ بھی کر سکتی تھی۔ یہی نہیں وہ انسان اور انسان کے درمیان اس کشمکش کو بھی دیکھ رہے تھے، جو کسی بھی تہذیب میں معاشرے کی ہموار ترقی میں مانع ہو سکتی ہے۔ یقیناً غالب کے



اشعار میں بعض اشکوں کا وہ مفہوم نہیں، جو تاریخ کی کئی منزلوں سے گزرنے کے بعد آج ہمارے ذہنوں میں موجود ہے۔ لیکن وہ الفاظ آج اور کل کے تسلسل میں ایک باہمی صورت کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب غالب ”دیوار ہار صبیح مزدور سے ہے تم“ کہتے ہیں تو اس میں اس مزدور سے جسے آج ہم پروڈیاریہ کے نام سے جانتے ہیں، ہم ردی کا کوئی شائبہ نہیں مگر اور نہ ہم اس تاریخی صورت حال میں، ان سے اس کی توقع کر سکتے ہیں۔ مگر جب وہ کہتے ہیں کہ:

مشق و مزدوری عشرت گاہ خسرو کیا خوب

ہم کو حلیم کو نامی فرہاد نہیں

تو یہ ایک ایسا حرکت آفریں شعر ہے، جو عشرت گاہ خسرو کے کلیدی محاذ سے معاشرتی سطح کے تضاد کو پیش کرتے ہوئے ماضی کی اقتداری روایات کو حلیم کرنے سے منکر ہے اور مستقبل میں ایک نئے باہمی عمل کا اشارہ بن جاتا ہے۔ غالب کو عشرت گاہ خسرو کی مزدوری پر اعتراض ہے، لیکن اس کا متبادل انقلابی عمل، اس وقت تک وقت کے نہاں خانے میں پنہاں تھا۔ غالب کے کلام کی رمزاتی حقیقت عکاسی حال کو مستقبل تک لے جاتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار کی نئی تعبیروں کی راہیں نکالتی ہے۔ اس ضمن میں اک ذرا مختلف کیفیت کے لیے غالب کا مندرجہ ذیل فارسی شعر بھی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اے گل ترہ رنگ دیں ایسا ہمہ نازش از چہ رو

صیغہ ابر یک طرف، مزد چمن طراز وہ

غالب کے متحد اشعار مستقبل کا رخ لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً:

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا احساں آخر

ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

☆

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش بھی ہو

آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھانگیں گے کیوں  
ہیں گرفتار دغا زعماں سے گھبرائیں گے کیا

☆

خوں ہو کے جگر آنکھ سے پکا نہیں اے مرگ  
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے  
آفری شعریٰ تفسیلِ جذبی نے کو یا اپنی نظم ”سوت“ میں پیش کی ہے۔ جو شاید  
ان کی سب سے کامیاب نظم ہے۔ واضح اشارۂ مستقبل کے علاوہ غالبؔ کے ایسے متعدد  
اشعار بھی، جو صریحاً ماضی سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے اعدادِ مستقبل کے امکانات لیے  
ہوئے ہیں۔ مثلاً:

آزادیِ حیم مبارک کہ ہر طرف  
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوئے گل

☆

بلخِ وحشت خرای ہائے لیلیٰ کون ہے  
خانہ بھلون صحرا گرد بے دروازہ تھا  
غالبؔ کے بعض مشہور فارسی اشعار روایتِ لفظی کے اعزاز کے ساتھ ساتھ  
انتخابِ آفرینی کے مضمرات بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً:

ہیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانم  
تھا پہ گردشِ رطلِ گراں بگردانم

☆

ہامن میاویز اے پدِ فرزندِ آذر راگر  
ہر کس کہ شد صاحبِ نظر دہنی بزدگیاں خوش کرد

☆

مردۂ صبحِ دریں تیرہ شبانم داد  
شیخِ کعبہ و زخو شدہ نکانم داد

غالب کی شاعری کا جسی اور فکری نظام انسانی مسائل کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ ان کے یہاں حقائق کا ادراک صرف خارجی یا سیاسی سطح پر نہیں۔ بلکہ وہ انہیں و آفاق کے حوالے سے انسانی وجود کی اس غیر ختم کھنکھ کو اپنا موضوع بناتے ہیں، جو عالم فطرت سے لے کر عالم محسوسات تک اپنا دائرہ وسیع کیے ہوئے ہے۔ غالب نے انسان کو تہذیب سے وابستہ سمجھتے ہوئے بھی، اسے عالم فطرت سے الگ نہیں کیا ہے۔ دو مقابل حقیقتوں یعنی تہذیب کی پابند شائستگی اور فطرت کی آزاد بے نقبی کے درمیان وہ انسان کو کسب کی راہوں سے گزرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ان کے لیے حوالہ حوادث ذات کے اندر بھی ہے اور ذات کے باہر بھی۔ سب مسائل، قصورات اور کیفیات ایک دوسرے میں نفوذ رکھتے ہیں اور عمومی و داعیانی کی باہمی آویزش جاری ہے۔ یہ کائنات طبیعی طور پر متحرک ہے اور جذبے کی گرمی سے رقصاں بھی۔ حقیقت اشیا، حقیقت ذات سے مربوط بھی ہے اور متضاد بھی۔ چنانچہ ہستی کو ہم و حقیقت اور ”ہے“ اور ”نہیں“ دونوں منزلوں سے گزرتے ہوئے غالب ادراک ذات تک پہنچتے ہیں لیکن ان کے نزدیک ذات معیار آگئی ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں تجا نہیں، بلکہ اسے خود اپنا عرفان دوسروں کے دینے اور کائنات کے واسطے سے ہوتا ہے۔ پھر خود کائنات اپنے طور پر اجتماعی گل کا طبیعیاتی یا ایجابی طبیعیاتی آئینہ ہے۔ غالب جب کہتے ہیں کہ:

نہ پوچھ وجہ نے خانہ جنوں غالب

جہاں یہ کاسے گردوں ہے ایک خاک انداز

تو یہ ”نئے خانہ جنوں“ صرف انفرادی انا کا ٹکس نہیں بلکہ انسانی انا کی توسیع

ہے اور تضادوں کے سب سے بڑے تضاد یعنی ایجاب و ذات اور اکثال کائنات کی مطابقت، بے خانہ جنوں اور خاک انداز کے لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں دائرہ یقین سے گزر کر حاصل لا حاصلی اور لا حاصلی حاصل دونوں ہوش رہا بن جاتے ہیں۔

برصغیر میں انگریزوں کے واسطے سے صنعتی تہذیب کا آغاز، جدید علوم اور

عالم۔۔ نظر اور طائر

سائنس کی فتوحات کا تعارف تھا۔ برصغیر ہی نہیں، انیسویں صدی میں دنیا کے بڑے سائنس دانوں، مفکرین اور دانش ورؤں نے سائنسی وسائل اور جدید علوم کے ذریعے انسان کی اب تک نامحاصل شدہ بہتری کے خواب دیکھے تھے۔ اگر یہ خواب پورے نہ ہوئے تو ان میں علوم اور جدید سائنس کا نہیں، ان سے کام لینے والے احتمالی مفادات کا قصور ہے۔ انسان ذرے کا دل چیر سکتا ہے اور چاند پر اپنا جھنڈا گاڑ سکتا ہے، لیکن اب تک اپنے معاشرے کی مصلحتانہ تنظیم پر قادر نہیں۔ اس نے کسی ایک خطہ زمین یا تمام عالم میں جو فساد بھی برپا کیا ہو، اس کے ساتھ ساتھ انسانی روح اور انسانی خمیر کو حزن، اضطراب، کشمکش، کرب، سختی، جنگ، غم، فساد اور مفاخرت سے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ کیا انیسویں صدی میں ہم یہی اجزائے شکست لے کر داخل ہو رہے ہیں؟

ایک صدی پہلے، عالم کو تمام آنے والے کوائف کا علم ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ انسان کی سرشت، معاشرے کے عدم توازن اور حالات کی اس کشمکش سے واقف تھے، جس نے اسے ہمیشہ مضطرب و محزون رکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدار حسرتِ دل ہے  
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچِ دریا کا  
☆

نہ گلِ فخر ہوں نہ پردہ ساز  
میں ہوں اپنی شکست کی آواز  
☆

کشمکش ہائے ہستی سے کرے کیا سہی آزادی  
ہوئی دلچیز موجِ آب کو فرصتِ روانی کی  
☆

نزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو  
دہی ہم ہیں گھس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ سماں ہے  
برقی خرمین راحت خونِ گرم دہقاں ہے  
مزدور ہو یا دہقان، زنجیر ہو یا زحمان ان علامات کے ذریعے جواب مفہوم کی  
نئی خصوصیتوں کی حامل ہو گئی ہیں، غالب نے انسانی احوال کی کرب ناک اور شوریدہ  
کیفیات کو پیش کیا ہے۔ وہ غیر متوازن معاشرے میں استبداد کی چہرہ دہی اور وسیع لاکھ  
مظاہرہ اشیا میں جبر کی بدبختی کی نقش طرازی کرتے ہیں۔ بار بار ان کے یہاں انسان  
اور آدمی کے تضادات نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اس مجموعی صورتِ حال کو  
فراموش نہیں کرتے جس کا انسان ازل سے اب تک شکار رہا ہے۔ چند قاری اشعار، اس  
باب میں غور طلب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

آرامشِ زمانہ ز پیدا کردہ اند

ہر خون کہ ریخت خازنِ روئے زمینِ شمس

☆

مگر آتشِ نفس دہانتِ نرد از اسیرانت

کہ دو از روزانِ دیوارِ دہقانِ برقی آید

☆

ہر چہ بنی بہ جہاں حلقہٴ زنجیرے بست

بچ جا نصرت کہ ایں دائرہ ہام زسد

☆

باویدہ و دل از دو سو، مانع بہ بیغم فرد

اندو پنہاں یک طرفِ آشوب پیدا یک طرف

☆

شوہر ہم دے تو صبر چہارو کہ وہ خواہم

بچے کاوارِ نالیدن ز دہقانِ برقی آید

☆

تا دل پہ دنیا داوہ ام، در کشش افکارہ ام  
اعدو فرصت یک طرف، ذوق تماشا یک طرف

☆

آئیدہ و گزشتہ قننا و حسرت است  
یک کاٹکے بود کہ پہ صد جا نوشتہ ایم

انسان جو غلوت میں الجھن اور بجائے خود محشر خیال ہے، کیا اسی طرح  
غیر انسانی صورت حال کا امیر اور بے چارگی کا شکار رہے گا؟ وقت کے دامن میں  
گرہ کشائی کا سامان بھی موجود ہے۔ غالب جو بے کسی میں بھی نجات اپنی ذات ہی  
سے کھینچتا چاہتے اور اتصال کو پنکھڑ زبونی ہمت کہتے ہیں، انسان کی تقدیر سازی کا یہ  
پیغام بھی دیتے ہیں کہ:

ترا کہ گفت کہ منت کشی ز چرخ کہو  
پہ قبر کام دل خوبشمن ز آخر کش

غالب کو فارسی شاعری میں روایت کی تقلید اور روایت کے چیلنج دونوں کا سامنا  
تھا، اردو شاعری نے انھیں نسبتاً زیادہ آزادانہ میدان فراہم کیا ہے۔ وہ کس آسانی سے  
احساس و خیال کو یک جا کرتے ہوئے، استعداد سازی کے ابتدائی اسٹاک کا چادو  
چنگاتے اور شاعرانہ تخیل کو تحریری صفت کا حامل بناتے ہوئے مادی و معنوی قافیوں کو  
سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

یہ پروانہ شاید باد بان کھنکھی سے تھا  
ہوئی بھلس کی گری سے روانی دور ساغر کی

لیکن فارسی کلام ہو یا اردو شاعری غالب نے انسان کو موضوع سخن بنا دیا ہے۔  
غالب سے پہلے اردو شاعری میں انسان کو بطور خاص میر اور آتش نے موضوع  
بنایا تھا۔ میر نے انسانی دروندی کے جن تاروں کو پھینکا ہے، ان کی شیریں موسیقی دلوں  
میں اتر جاتی ہے اور ان کی شعری تصویروں کی زیبائش، تاثر و تزیین کے منفرد رنگوں سے

ترجیب پاتی ہے۔ آتش نے انسانی عزم و ولولہ کو خاص طور پر مرکبِ تہجد بنایا اور اپنی شاعری میں ایسی حب و تاب بھری کہ اس کی لے کی توانائی نیا سامانِ ظالم فراہم کرتی رہی ہے۔ اقبال نے انسانی عظمت کو جس جس طرح نئی نئی شکلوں میں نمایاں کیا ہے۔ اس کی اردو شاعری میں قدر آفریں حیثیت ہے۔ ان کی شاعری سے عصرِ حاضر کا فکری شعور مستحکم ہوا اور شعری جمالیات کو نئی بنیادیں ملی ہیں۔ اقبال مشرق و مغرب کے معیاراتِ فکر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مفکرانہ جلال کا نقش ثبت کرتے اور انسان کو تفسیرِ کائنات کی منزل تک لے جاتے ہیں۔ فیض نے سیاسی جدوجہد سے انسانی بڑائی کے رنگوں کو تابانی بخشی ہے لیکن وہ محض تفسیرِ کلمہ و واقع سیاسی نہیں بلکہ ان کی شعری جمالیات روحانیت و حقیقت کے احراج کے ساتھ ساتھ تصور کو عمل اور عمل کو دل کی لڑش بنانے کی جو غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے، اس سے انسانی فطرت پر محکم یقین کے متعدد پہلو نکلتے ہیں۔ عالم یقین کے کسی خوش خبر نگار، خیال کی آسودگی کی بجائے اقدار کی تکفیر کے پیہم اضطراب میں گرفتار ہیں۔ جاگیردارانہ معاشرتی قدروں سے وابستہ ہوتے ہوئے وہ سرمایہ دارانہ نظام کے آغاز کی خوش ترکیبی سے متاثر ہوئے لیکن انسانی وجود کا ناظر ان پر حسن و قبح کے نئے زاویے منکشف کرتا اور آشوبِ نظر کا طلسم بچ و تاب میں جاتا ہے۔

خیال اور مادے کے جس تعلق کو حالی نے تنقیدی شعور کے ساتھ ادبی محاکے کی بنیاد بنایا، اس کی جانب لطافت و کشادگی کے لنگھوں میں عالم نے پیش قدمی کی تھی اور اپنے بیان سے شاعرانہ تجربے کے اظہار کی صورت نکالی تھی۔ عالم نے انسانی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی حزنِ صورت حال کو بھی زبان بخشی ہے۔ عالم کا انسان، خواب اور حقیقت کی تکفیر میں کئی زمانوں کے مقابل ہے اس کی زندگی اندرونی اور بیرونی طور پر جن المیوں میں گرفتار ہے، ان سے اس کی آزمائش کی راہیں زیادہ دشوار گزار ہو جاتی ہیں۔ مگر ماضی و حال میں اس کے کرب کی اذیت مستقبل کی آرزو مندی کو زیادہ گہرا کر دیتی ہے۔ عالم ماضی حقیقتوں اور مستقبلِ تعبیروں کے علاوہ مظاہر کے رشتوں

غالب۔ نظر اور غبار۔

میں تصور کی کار فرمائیں کو بھی جلوہ گر دیکھتے تھے۔ ان کی فکر سے قدامت پسندی پر ضرب لگی اور روشن خیالی کی ارتقا پذیری کو تقویت حاصل ہوئی لیکن وہ بے کراں وقت کے تناظر میں کائنات کے اسرار و رموز کی اس ہزیت کو بھی بخش کرتے ہیں جو وجود و عدم، موجود و مابود اور شے و لاشے کو مربوط کرتی ہے اور جن کے باہمی تعلق کی تلاش میں خیال ہمیشہ کوشش رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تصوف غالب کے لیے محض ”حال“ کی حیثیت رکھتا تھا ”حال“ کی نہیں، لیکن تصوف کی وسیع روایت کو نظر انداز کر کے غالب کی سمیحات، اشارات اور معنیات کی صحیح توجیہ نہ ہوگی۔ اسی طرح صرف مشکل لفظوں کی تشریح کر کے شارحین غالب خود اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے اور معنی غالب کی تفہیم میں مانع ہوتے رہے ہیں۔ غالب کے لیے جمہوریت اور طبقاتی جدوجہد کے مفاہم ناقابل فہم تھے۔ لیکن طبع اشرافیہ سے ذہنی اور تہذیبی وابستگی کے باوجود غالب کے یہاں انسان دوستی کا وہ چراغ روشن نظر آتا ہے، جس کی کرنیں آج تک ذہنوں کو منور کر رہی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض آزاد خیالوں کے بارے میں چاہے وہ غالب سے پہلے ہوں یا بعد کے، خود غالب کے لفظوں میں ”اگلے دہائی کے ہیں، یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو“ کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ان کی آزاد خیالی ایک ایسی انسانیت کا نشان ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کو بچانے سے قاصر ہے اور اسی لیے قدامت کے انہار میں گم ہوگئی ہے۔ ایسی آزاد خیالی جو ذات کی نمائندگی کی صورت گرے، اس انسان دوستی سے خالی ہے، جس سے زندگی کو ایک ایسا انداز نظر ملتا ہے جو برداشت و عقل کے ساتھ صرف ناگوار ذہنی اثرات کے خلاف نہیں بلکہ تمام نا انصافیوں، بد نمائیں، سختیوں اور حوادث کی جبری صورتوں کے مقابل صف آرا رہتا ہے۔ اس کا دائرہ شخصی پسند اور ناپسند سے بلند ہے اور اس میں مستقبل کے نئے امکانات کی جستجو کلیت کی بجائے مرحمت کے نقوش استوار رکھتی ہے۔ اس میں زندگی کی انفرادی عمر میں اور کشش و اتصاف کی پیدا کردہ عجیبے گیوں کے باوجود اجتماعی تعلق کا احساس ہوتا ہے۔ پھر یہ تعلق اپنے اندر رنگ تصورات کی ثروت لیے ہوئے ہے اور یہ ثروت حقیقی ربط سے نہیں، مثبت تعلق سے ظہور میں آتی ہے۔ اس



انسان دوستی کے احساس کی لہروں میں امید کی خوشی اور مایوسی کا اضطراب دونوں شامل ہیں۔ لیکن ذات کے پار حقائق سے آزاد، نوع انساں کی آزادی اور بہتری کی خواہش بھی اس کی متوازن موج ہے۔ انسان کی فکر زندگی اور زبانوں کا ازل سے اب تک سہی، اب تک مقدر نہیں۔ انسان اپنے وجود کی سرگراں تمناؤں سے دوچار ہوتے ہوئے بھی وسیع عالم انسانیت سے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کی بحر انگیزی اور اپنے تخلیقی عمل کی طرح انگلی سے بحال و زیبائی کے مظاہر عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ یہ انسان دوستی آگہی ذات اور معاشرے کی ہم آہنگی سے وجود پاتی ہے اور تخلیقی اتنا کو اپنی تہذیب ہی نہیں، عالمی انسانی تہذیب کا حصہ بناتی ہے۔ تخلیقی اتنا کی یہ وسعت ہمیں عالمِ کلام میں نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عالمِ کلام میں اس انسان دوستی کی تابانی ہے، جس سے مستقبل کی انسانی جمہوریت روشنی پائے گی۔ اسی لیے ان کے کلام کے نئے نئے گوشے روز بروز زیادہ نکھر کر سامنے آ رہے ہیں۔



## جنونِ ساختہ و فصلِ گلِ قیامت ہے

خسرو سے لے کر جوجن، اقبال اور فیض تک بڑے اور اچھے شاعروں کے یہاں اشعار میں بھی ایسے نکات ملتے ہیں، جو ان کے فنی نقطہ نظر کی غمازی کرتے اور ان کی تنقیدی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں۔ ابھر خسرو نے شاعری کو علم سے بالاتر سمجھتے ہوئے کہا تھا کہ:

ایں کہ نامِ شعر غالب ی شود بر نامِ علم

جنتِ حقیقی دریں من گویم از عرفاں بود

اقبال نے تخلیق کے لیے بے چینی جاں کو اہم قرار دیتے ہوئے شکایت کی تھی کہ:

کم نظر ہے چلی چاہم نہ دید

آکھرم دید و پیناہم نہ دید

ہماری کلاسیکی گزشتہ شعر نے، جن میں عربی اور فارسی روایات شاعری شامل ہیں، معنی، حسنِ معنی اور معنی آفرینی کے لیے وسیع سرمایہ فراہم کیا تھا۔ چنانچہ جب حالی نے پہلی بار اردو میں نظریاتی تنقید کا آغاز کیا تو احتجاج کی کئی صورتوں میں بھی اس سرمایے سے بہت کچھ استفادہ کرتے ہوئے، جدید ادبی و معاشرتی احراجات کی نشان دہی کی تھی۔ ان کی یہ نشان دہی بھی نئی تعبیرات اور موجودات کی نئی فکری تشکیل

ہونے کے باعث تخلیقی عمل کہی جاسکتی ہے۔ حالی خود ایک خلاق شاعر تھے اور ان کی تنقید ایک تخلیقی جہت رکھتی ہے۔ لیکن جس طرح تخلیق میں تنقیدی نکات، خود علم تنقید کا بدل نہیں، اسی طرح تنقید کے تخلیقی اوصاف اسے ایک تخلیقی عمل کے درجے تک تولے جاتے ہیں، لیکن ایک باقاعدہ صحب تخلیق نہیں بناتے۔ الہیہ تخلیق و تنقید دونوں کو ایک دوسرے میں اثر و نفوذ حاصل ہے اور ان کی جامعیت بعض اوقات اعلیٰ تنقیدی اور بڑے تخلیقی کارناموں کا سبب بن جاتی ہے۔ تنقید کے تخلیقی عمل پر اظہار خیال کرتے ہوئے، راقم الحروف نے مطالعہ ادبیات و علوم، احباب، ترقیب، تعبیر، نظائر زندگی، نظام اقدار اور بیان کے ایسے اوصاف کا ذکر کیا تھا جو تنقید کو تخلیقی سمت عطا کرتے ہیں۔ (سائنسدان ادب لطیف ۱۹۶۰ء) پھر بھی تنقید اور تخلیق کے دائرے الگ الگ الگ رہتے ہیں۔

یہ مطالعہ بھی بہت ضروری ہے کہ خود تخلیق میں جو تنقیدی نظر ملتی ہے، ہر بڑے گھسنے والے کے یہاں اپنے زمانے کے حالات و تصورات کے پس منظر میں اس کی کیا صورت رہی ہے؟ اس مطالعے سے بہت سے گوشے واضح ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تنقید اور تخلیق کی گہری وابستگی کے باوجود ایک کو دوسرے کے دائرے میں لانے کی کوشش دونوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ تنقید میں اس سے ایک زخمی مطالعے یا تاثراتی طرز نگارش کو تقویت ملتی ہے اور تخلیق میں حوازیات زندگی کی دریافتوں کے ہمراہ فن یا زندگی سے حلقہ تنقیدی بیانات بے رس اور بے جان رہتے ہیں۔

عالم نے متعدد مقامات پر تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں وہ اپنی ناقدرانہ بصیرت کا اظہار کرتے ہیں، وہاں اکثر واقعی زندگی سے موجودات و کیفیات کی کوئی حوازی صورت بھی سامنے لے آتے ہیں۔ عالم شاعری کے شعیرہ ہائے بیان میں سرآمد روزگار شمار ہوتے ہیں لیکن جہاں ان کا تخیل وسیع ہے، وہاں ان کی تنقیدی نگاہ بھی شاعری میں ہی جلوہ گری کرتی ہے۔ نثر میں عالم کے جو تنقیدی بیانات ملتے ہیں، وہ بڑی حد تک شاعرانہ روایات کی تحلیل و توصیف اور

اسالیب شاعری پر مبنی ہیں اور یہ نہ ان کی فکری رسائی اور نہ ان کے بے ساختہ اعتقاد نثر کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نثری بیانات میں لفظوں کی پرکھ اور اسالیب کی شاعرت کی کوششیں اہم سمجھی، ان میں اس نظارہ زندگی کی جو تھقید کے لیے بھی ضروری ہے، وہ صفت نہیں ملتی جو تھقید یا تخلیق کو سرمایہ دانش و اعتبار بناتی ہے۔ شاعری نہیں نظارہ بھی لفظی ساختوں سے الجھنے یا شاعرانہ زیبائی پیدا کرنے کے قصور و عیوب میں محدودیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ خود غالب پر رشید احمد صدیقی کے بہت مشہور بیان سے کہ جس میں غالب کو اردو اور تاج محل کے ساتھ مظلوم کی تہذیبی دین بتایا گیا ہے، اس حصے میں بھی جو غالب کے متعلق ہے، غالب کی ماضی کے علاقہ تہذیب سے وابستگی تو معلوم ہوتی ہے، ان کی شاعری میں مصری عناصر مزاحمت اور مستحکم کے علاوہ و رموز کے جو نقوش پائے جاتے ہیں، ان کا حال نہیں کھلتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود غالب کا رحمان قادری شاعری میں اپنی فکری تازگی کے باوجود، بیان کی محافظ کاری کی جانب رہا ہے۔ اس کے برخلاف اپنی اردو شاعری میں وہ بیان کے بعض ایسے اسالیب بھی اختیار کرتے ہیں جو روایت سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ گویا ان کی فکری ہمت، اعتبار کی ہمت میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ غالب کے قادری خطوط کی بجائے ان کے اردو خطوط اختراع قائم ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے ہاں صورت و معنی کا رشتہ ان کی اردو تحریروں میں مستحکم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ صورت و معنی کی ایسی یکہ جانی جو کسی ادبی شخصیت کی بہترین نمائندگی کرتی ہو، نثر و نظم میں الگ الگ دائرے رکھتی ہے اور دونوں میں روایت سے پوری واقفیت و وابستگی کے باوجود، کھینچنے والے کی تحریروں کو رائج اسالیب اعتبار یا پہلے سے قائم شدہ اوصاف کے حامل ہونے کی ضرورت نہیں۔

غالب کی شاعری، ذوق کی شاعری کے مقابلے میں زبان کی صفائی اور بیان کی روانی کے اعتبار سے کم تر ہے۔ اسی طرح مومن کی سی ریختی اور نفسی کی بھی غالب کی شاعری میں کمی ملتی ہے۔ لیکن غالب کی شاعری میں جو وسوسیں ہیں، وہ ذوق

اور مومن کے اعجازِ بیان میں ادا نہیں ہو سکتیں۔ اعتبار کے الگ الگ شیعوں کے باوجود، فکری گہرائی میں، غالب کا اگر کوئی حریف ہے تو صرف میر ہیں اور غالب نے کئے دل سے میر کی اقلیت اور بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن میر کے نظامِ اقدار کو ان کے دل دردمند کے ساتھ ساتھ، سلسلہٴ روایاتِ صوف کی وہ آسودگی حاصل ہے، جو ان کی اپنی اہم انگیز کیفیتوں کو بھی ایک نقطہٴ تعلیم عطا کرتی ہے۔ غالب بھی فروغِ سخن کے لیے دل گداخت کے قائل ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں مختلف تصورات کی آویزش، قدیم و جدید کی جنگ و جدال، جذبات و خیالات کی مکملش اور متحسسات کے تصادم نے جس کرب و اضطراب کو راہ دی ہے، وہ اپنی ترکیب پذیری کے لیے نئی دنیا اور نئے انسان کا منتظر ہے۔ اسی لیے غالب کی شعری صورتیں نئے فکری نشانات کی حامل ہیں۔

غالب کی حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش کے لیے کبھی ہوئی غزل کے اشعار پر ہی نظر ڈالیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس رواجی ماحول میں بھی غالب کی شاعری جو روایت سے منسلک بھی ہے، اپنے عصر کی آزمائش سے ہی نہیں، مستقبل کی گیر و دار سے آواز ملا رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

قد و گیسو میں قمیص و کوہِ کن کی آزمائش ہے

جہاں ہم ہیں وہاں دار و دین کی آزمائش ہے

کریں گے کوہِ کن کے حوصلے کا امتحان آخر

جنوز اس خشت کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

یہ ایسے اشعار نہیں جن سے شاعرانہ تخیل اور ذوق و شوق کے نتیجے میں وجود پائے ہوں بلکہ ان میں خارجی مظاہر، جذباتی کیفیات اور شاعرانہ دانش کو باہم مربوط کر کے دور رس نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ غالب کے ایسے اشعار بھی جن میں تنقیدی بصیرتوں کی بھلیاں چمک رہی ہیں، تعداد میں کم نہیں، لیکن ان کا بڑا وصف یہی ہے کہ انھیں اکثر زندگی کی حوازیات سے آب و رنگ دیا گیا ہے۔ ایسے چند اشعار ملاحظہ

ہنوز اک ہرچہ نقشِ خیال یار ہاتی ہے  
دلِ افسردہ گویا ہجرہ ہے یوسف کے دنداں کا

☆

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں گل  
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ چٹا نہ ہوا

☆

بے نئے کسے ہے طالعِ آشوب آگئی  
کھینچا ہے ہجرِ حوصلہ نے خطِ ایام کا

☆

تالیفِ نثر ہائے وفا کر رہا تھا میں  
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

☆

آتشِ کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے  
اے دوائے اگر معرضِ اکتہار میں آوے  
تنبیہٴ معنی کا ظلم اس کو سمجھے  
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

☆

مجھے انصافِ فہم نے ہے عرضِ حال بخشی  
ہوئی غزلِ سرائی، تہنِ فسانہ خوانی

☆

یہی بار بار ہی میں مرے آوے ہے کہ غالب  
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میرانی

☆

برودے شش بہت در آئینہ باز ہے  
پس امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

☆

درد دل کھوں کب تک چاؤں اُن کو دکھا دوں  
انگلیاں نگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

☆

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا  
مگر نہیں ہیں مرے اشعار میں سستی نہ سہی

☆

ہاں نکلا آمدِ فصلِ بہاری دلہ وا  
بحر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

☆

فریاد کی کوئی نے نہیں ہے  
نالہ پائیو نے نہیں ہے

☆

حسن ہے پروا غریبِ احتراعِ جلوہ ہے  
آئینے زانوے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

☆

حسی فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد  
پہلے دلِ گداشتہ بیٹھا کرے کوئی

☆

عالمِ غبارِ وحشِ بھتوں ہے سرسبز  
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

☆

سوزشِ باطن کے ہیں احباب ٹنکر درتِ بیاں  
دل محیطِ مگر یہ و لب آشنائے خندہ ہے

☆

بلکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں غوں ہو ہو کر  
شہرِ رنگ سے ہے بالِ کشا موجِ شراب

☆

کمالِ مگر یہ سہی تلاشِ دید نہ پوچھ  
برنگِ خار مرے آنکھ سے جو ہر کھینچ

☆

ہر چند سبک دست ہوئے بتِ فلفلی میں  
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

☆

مگر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے  
غوشِ ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

☆

کس کو ستاؤں حسرتِ اظہار کا ٹکڑہ  
دلِ فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

☆

غبن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے  
جگر کیا ہم نہیں دیکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

☆

تیرے قوسن کو صبا باندھتے ہیں  
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

☆



مٹائے حیرت آئینہ ہے سامان رنگ آخر  
تکیز آپ بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

☆

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا  
سمجھا ہوں دل پذیر متاع ہنر کو میں

☆

مستانہ طے کروں ہوں رم وادی خیال  
تا ہزار گشت سے نہ رہے مڑعا مجھے

☆

اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا  
آگ مطلوب ہے، ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمام تخلیقی یا تخلیدی نکات "نگس کی تے" نہیں ہیں۔  
ان میں اپنے ماحول و متمدن سے وابستگی اور زندگی کی بدلتی ہوئی صورتوں کی شناسائی  
کے ساتھ ایک ایسی ذہنی قوت ملتی ہے جو تخلید کے سرتاسر خلاف ہے اور چہرہ کاری کی  
بجائے عیش قدی کی خواہاں ہوتے ہوئے جامد خیال کی جگہ آزادی فکر کو ملح نظر بناتی  
ہے۔

ادبی تخلید کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اس سے زیبائی اور نازیبائی کی یکجہ  
جہتیں واضح ہوتی ہیں۔ جدید تخلید نے ان کا تعلق ماحول اور معاشرے سے بھی قائم کیا  
ہے، لیکن بعض نئی ادب کے دبستانوں کے علاوہ ادبی تخلید کے متحدہ دبستانوں میں سے  
کسی نے ادبی تخلیقات کے محاکے اور قدر و قیمت کے تعین کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ یہ  
صحیح ہے کہ کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین حتمی اور آخری نہیں ہوتا اور پرکھنے  
کے بنانے بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن کسی نہ کسی معیار کی جستجو جاری رہتی ہے اور یہ جستجو  
خود اپنی جگہ بڑی ہیبت رکھتی ہے۔ یہ نہ ہو تو خراف ریزوں سے ایمان الٰہی ادب بڑے ہو جائے

غالب... نظر اور طرز

اور جواہر پارے خاک میں لوٹے نظر آئیں۔ پھر معیار کی تلاش جاری رہے تو ادب کی جمہوریت بھی اطراف و تقریب کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ ادب کی اس جمہوریت میں بنیادی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ یہی حیثیت، انسانی اقدار کی محرک قوت ہے۔ البتہ کچھ ایسے تصورات بھی ملتے ہیں جو انسانی اقدار کی نفی پر مبنی ہیں۔ ان سے ہی نئی ادب کی راہیں بھی نکلتی ہیں۔ ادب کے محاکے اور قدر و قیمت کے فیصلے سے جاری تصورات نقد، دراصل زندگی کی فہم و دانش سے بھی انکار کرتے نظر آتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ مطالعہ ہیئت کے بہت سے عہدوں کے باوجود سبک شناسی کا کام بھی انکار و اذہان کے تاریخی علم کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا اور کورے کاغذ سے روشن گل نہیں نکالا جاسکتا۔ پھر ادب کے قاری اور ادبی تخلیق کی قرأت پر زور دینے والوں کے لیے، رابرٹ براؤننگ کا یہ بیان حد درجہ قابل توجہ ہے کہ کتاب کے پڑھنے کے لیے واقعی انسان ہونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ تخلیقی فکر کے دوسرے سرے پر قاری اور قاری کی انسانیت ہے حد اہم ہیں۔ اگرچہ اس کے اپنے حدود بھی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مطالب جو اشعار غالب سے اخذ کیے جاتے رہے ہیں، کیوں ان کے ہم عصروں کے کلام سے مضبوط نہیں کیے گئے؟ اس کے باوجود ادب کی جمہوریت، دونوں سطحوں یعنی تخلیق کار اور قاری کی سطحوں پر انسانی اقدار کی پاس داری کو ملحوظ خاطر رکھتی ہے۔ یہاں یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ کوئی بوطیچہ اگر انسان کو تخلیق سے خارج کر دیتی ہے تو کیا وہ کسی انسانی معاشرے کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے؟ اسالیب اعتبار کی کلیہ لفظی ساقیات کسی یقین معنی شناسی کی منزل، صورت شناسی سے آگے ہے۔ ادبی تخلیق پر غور کرتے ہوئے تجویز صورت کو چلی سب اور ادراک معنی کو بالائی سطح قرار دے لیں تو چلی سطح سے بالائی سطح تک پہنچنے کی کوشش بھی ملتی ہے اور اقدار کی پرکھ میں دونوں کی اہمیت ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ:

نہیں مگر سر و برگ ادراک معنی

تماشاے نیرنگ صورت سلامت

اولین اہمیت تو ادراک معنی کو حاصل ہے لیکن وہ تماشاے نیرنگ صورت کہہ

کر بہت سے تنقیدی گوشوں کی جانب اشارہ کر گئے ہیں۔

غالب کے تنقیدی نکات میں، ان کے اپنے اور دوسروں کے بعض اشعار کی پسندیدگی کو بھی شامل کر لیا جائے تو ذوقِ غالب کی تفہیم کے حدود وسیع ہو جاتے ہیں۔ غالب نے اپنے انتخاب و پسندیدگی میں کچھ اشعار لیے، کچھ چھوڑے لیکن اس سے اختلاف اس لیے ضروری نہیں کہ غالب کی تنقیدی بصیرت، ذوقِ تمیزات سے کام لیتی ہے، نظری مباحث کی پابند نہیں۔ غالب نے ذوق کے گھبرا کے مرجانے کی خواہش رکھنے اور سر کر بھی چین نہ پانے کے امکان سے دل بچک ہونے والے شعر کو نہایت پسند کیا تھا، کیوں کہ یہ ان کے اپنے ذوقِ شعری کے قریب تھا لیکن ذوق کے اپنے رنگ کا غزل میں کوئی کامیاب ترین شعر ہو سکتا ہے، تو وہ شاید یہ ہے کہ:

آتی ہے صدائے جری نازِ لیلیٰ

پر حیف کہ مجھوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

اس شعر میں روایت کے تسلسل کے علاوہ زبان کی غریبی اور ایک عاشقانہ کیفیت متفکر ہو گئی ہے۔ اس کے شاعرانہ تصور اور عاشقانہ تصویر میں ایسی خصوصیتِ تعمیم ہے جو دل چنم اور دل گداز ہے۔ خیال کی اصل صورت سازی وہی ہے جو زندگی کی حوازیات سے کام لینے کا ہنر جانتی ہو۔ چنانچہ غالب کے تمام تنقیدی نکات میں، شاید سب سے بہتر شعر وہی ہے۔ جو فن کے کسی تصور کے برابر راست اظہار کی بجائے زندگی کی ایک حوازی صورت کو پیش کرتے ہوئے، بالواسطہ ایک پوچھنے کی بنیاد رکھتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ:

دقا مقابل و دھماے عشق ہے بنیاد

جنوں ساخت و فصل گل قیامت ہے

اس شعر کے سارے اجزائے بیان پہلے سے موجود ہیں۔ اس کے باوجود اسے عمدت خیال اور حوازی صورت گری کی بہت اچھی مثال کہا جاسکتا ہے۔

صعب غزل میں شعر گوئی کا جو سامان اور سرمایہ ساخت پایا جاتا ہے۔ اس

سے ساختیت پسند بہت جگہ اخذ کر سکتے ہیں کہ دوسروں کے اقوال نقل کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ خود تلاش و تحقیق کا کام سرانجام دیا جائے۔ لسانیات کے زیر اثر زبان کے متعدد مطالعات میں ساختیت اور پس ساختیت نے بھی ایک مطالعے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور ادب کی تفہیم میں اسے بھی ایک اوزار کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس سے ادب یا ادب پارے کی کلیت تک رسائی ممکن نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض ترقی پسند (مثلاً پراگ اسکول) اور بعض رجعت پسند حلقوں نے اسے اپنے سماجی اور غیر سماجی مقاصد کے لیے استعمال کیا، لیکن یہاں اولین حیثیت پھر ان مقاصد کو حاصل ہو جاتی ہے، جن کے لیے یہ انداز تجزیہ ایک ذریعہ بنتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نکتے والوں نے علمی انداز سے ان مباحث پر قلم اٹھایا ہے اور بعض نے لسانیاتی مطالعوں سے زندگی کے فکر و فلسفہ کی جستجو کے پہلو نکالے ہیں۔ لیکن ان کی اس دقیق نظری سے الگ بعض عمومی بیانات کو جیسا کہیوں کی طرح استعمال کرنے والے بھی ہیں، وہ خواہ کسی زبان میں بھی لکھتے ہوں۔ ان کا مقصد نہ استہوار پسندی ہے، نہ انقلاب آفرینی بلکہ بہت ہی ہوئی زد کے ساتھ روانی ہے۔ لسانیات پر نظر کے لیے کسی مدرسہ سانہ اذعان کی بجائے طالب علمانہ ذہنی تنظیم ضروری ہے اور اس پر کوئی قابل ذکر کام تو ایک عمر کی ریاضت کا متقاضی ہے کہ یہ ایک الگ گوشہ مطالعہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے ذریعے صفت تحقیق کا تجزیہ اور جوہر تحقیق کی گہریت آسان نہیں، کیوں کہ یہ انسان اور معاشرے کے گونا گوں تعلقات اور فطرت و ہدایت کی متقلبات و مختلف جہات کا نتیجہ ہیں۔ پھر بھی لسانی مطالعات کا اپنا دائرہ ہے۔ چنانچہ ایک جملے سے دوسرے جملے کسی طرح پہونچتے ہیں، نئی ہوئی قواعد اور رواں بیان و کلام میں کیا کیا فرق رہتا ہوتا ہے، اشارہ کنندہ اور موضوع اشارہ میں کیا جھپٹیں ہیں، رمز و پیام کیا ہیں اور ہر ادبی تحقیق کی اپنی قواعد ہے یا وہ مقررہ قواعد سے انحراف پر مبنی ہے؟ ان سب سوالوں کا خالص علمی انداز سے جواب دینے کی کوشش کی جاسکتی ہے اور بعض ملکوں میں کی گئی ہے۔ پھر ایک طرز ادا کی لسانی صورت، تصوراتی شکل سازی اور نوعی

خصوصیت کا بھی جائز مطالعہ کیا جاسکتا ہے، اگرچہ اس میں جو محنت ہے اس کی وجہ سے اس جانب توجہ کرنے والے کم ہوں گے۔ لیکن یہ سب مطالعات گہمیں ادب کے لیے سودمند بن سکتے ہیں۔ البتہ ادب کی شخصی، تاریخی، عصری اور مستقبل پر اثر اندازی کی حیثیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تہذیبی ارتقا اور انسان کے تاریخی سفر سے مربوط ہیں۔ ادب نہ اپنے عصر سے بیگانہ ہو سکتا ہے، نہ بالکل غیر ذاتی بن سکتا ہے اور نہ نقش خیال میں جو صورت فرما ہے، اسے مٹایا جاسکتا ہے۔ اسے مٹانے کی تمام کوششیں غیر انسانی اور مخالف سماجی رذیلوں کی جانب لے جاتی ہیں۔ پھر ادبی تحریر ایسی خوفناک تحریر بھی نہیں کہ مشین سے خود بہ خود مکناکٹ برآمد ہو جائے اور نہ کوئی گورلا اعظافا و تصادفا بار بار کی کاوش سے حروف چھپی یا حروف چھپی کی کلیدی تختے والی مشین پر ہاتھ مار مار کر مسجوق قرطبہ یا نابھن کامیڈی لکھ سکتا ہے۔ انھیں لکھنے کے لیے جس جوہر اور جذبے کی ضرورت ہے، وہ ایسی اساس ہے کہ جس کی گرفت صرف اجزائے بیان کی تفریع اور ٹھٹھک کے تجربے کے بس سے باہر ہے۔

غالب نے پیش کردہ شعر میں فصل گل، جنون، وفا اور عشق کے پہلے سے موجود روایتی سرمائے سے جو کام لیا ہے، اس میں ان کے تخلیقی جوہر، تاریخی واقعہ، اجتماعی شعور، تنقید عصر اور تصور پسندی سب کی جھلک ملتی ہے۔ یہ کیسی نئی اور حیرت انگیز صورت حال ہے کہ وفا کے ہوتے بھی دھوائے عشق بے بنیاد ہے۔ لیکن اس خیال کی متوازی صورت سازی غالب نے ”جنون سائنس و فصل گل“ سے کر کے بیان کے دائرے کو وسیع کر دیا اور ”قیامت ہے“ کے ٹکڑے سے خود اپنی میزان اقدار کے ساتھ حزن انسانیت کو نمایاں کیا ہے۔ اسے اگر ہم تخلیق پر منطبق کریں تو کیا دلوں تخلیق نہ ہوتے ہوئے صرف بنی بنائی صورتیں یا ان کے اجزا جنھیں بعض حلقوں میں اساسیات سمجھا جاتا ہے، فن کا نقش جھانکتے ہیں؟ دراصل اس شعر میں وہ ایک حقیقت کے عاشقانہ پہلو کے اظہار سے بری ہوئے ہیں اور رومانی روایت کو روکیا ہے۔ خود عاشقی یا جذبے سے جہی دھوائے عاشقی پر جو طرز غالب نے روا رکھا ہے، اس کے لحاظ سے

غالب۔ فکر اور نگار۔

دقائقِ اقداری جہات رکھتے ہوئے، عذرتِ خیال اور عذرتِ اظہارِ دلوں سے سروکار رکھتے ہیں۔ پھر پیش کردہ متوازی صورت، جمالیات کا نقشِ مستحکم کرتی ہے۔

پہلے غالب نے ایک مظلوم عشقِ صورت حال کو پیش کیا ہے اور پھر اس کی متوازی صورت گری کا جادو چکایا ہے۔ جس میں دلولہ کاری کے خارجی موجودات کے ہوتے ہوئے، جنہیں لصل لُٹل کہا جاسکتا ہے، وہ بنی بنائی، مصنوعی اور غیر حقیقی صورت جنوں کو قیامت قرار دیتے ہیں۔ تخلیقی دلولے سے الگ ہو کر جنوں ساخت ایک ایسا میکاکی رویہ ہے جسے غیر انسانی قرار دے سکتے ہیں۔ غالب نے اسے قیامت کہہ کر اپنے بشری غم کا اظہار کیا ہے۔

اردو شاعری اور خصوصاً غزل کی شاعری پر بڑا اعتراض بھی رہا ہے کہ اس میں روایات، علامات، تلمیحات، ترکیبات، مفروضات بلکہ تصورات تک کا ایسا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ شاعر کا کام صرف انہیں ترتیب دینا رہ جاتا ہے۔ لیکن اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہر بڑے شاعر نے اپنی عصری آگہی، انفرادی مزاج اور فنی لریزوں سے تخلیقات کے نئے سانچے ڈھالے ہیں اور ان کے حیات و کائنات کے تصورات بڑی حد تک اپنے پیش روؤں سے مختلف رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سحر کی عاشقانہ دردمندی، آنکھ کی شکندہ جسامت اور غالب کی ذہنی بلندی نے ان کے شعری افادات پر اثر ڈالا ہے۔ اردو شاعری میں غزل اور غلام غزل کو سامنے رکھا جائے تو گہری سائنس کی تلاش اور مابینِ سائنس کی گفتیش کے بہت سے عقدے وا ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مغرب کے بعض جدید نقادوں نے قدیم عہد کی مشرقی تنقید سے فائدہ اٹھایا ہے اور آج اردو میں جدید کے نام سے پیش کیے جانے والے مغرب کے بعض تنقیدی تصورات مشرقی تنقید کے بیان اور اجزائے بیان کی ترتیبی اہمیت کی یاد دلاتے ہیں۔ البتہ اردو میں اقدار کی پرکھ پر مبنی تنقید سے جس زد کا آغاز ہوتا ہے وہ اپنی وسعت، سماجی علوم سے فیض پائی اور زندگی کے حوالوں میں قدیم طرز فکر سے مختلف ہوتی گئی ہے۔ لیکن اس کے لیے جاتی کو مقدمہ لانے کی ضرورت پیش

آئی تھی اور یہ مبارزت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تنقید اور فکری تنقید کا عمل جاری رہنے سے اولی ارتقا کے عمل کو تنقید ملتی ہے اور مختلف تنقیدی نظریات کی کشمکش بھی زندگی کی کشمکشوں کی مظہر بن جاتی ہے۔ لیکن کسی ایسے نظریہ تنقید کا دم بھرنے والوں کے لیے کہ جس کی وابستگی ہمارے معاشرتی حالات سے کم ہو یا بالکل نہ ہو، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پہلے وہ اس کے بیرونی مفکرین کی تحریروں کے اردو میں مفصل ترجمے کا کام سنبھالیں، پھر حسب توفیق ان کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنے ادب کی تحلیل و تخلیق کے نمونے پیش کریں کہ ان کے بغیر نرے دعووں سے بات آگے نہیں بڑھتی اور نہ صرف مفروضات کی تکرار کافی ہوتی ہے۔

غالبؔ نے صریح طور کو نوائے سرودش کہا تھا، ایک زمانے تک ادب کے الہامی تصور نے اپنی حکومت قائم رکھی۔ لیکن رفتہ رفتہ تخلیق کے انفرادی اور اجتماعی محرکات بھی سامنے آتے گئے۔ حافظؔ نے لطیف سخن کے ساتھ ادب کی مقبولیت کو بھی خدا داد بتاتے ہوئے کہا تھا کہ:

حد چہ ی بری اے سست نظم بر حافظ

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

اس میں شک نہیں کہ نکلنے والوں کو اور بعض اوقات قبول عام رکھنے والوں کو حد کا شمار ہونا پڑتا ہے۔ غالبؔ نے بھی حد کو سزائے متاعِ سخن قرار دیا تھا۔ وہ اپنی شاعری کی کم مقبولیت کے شکوہ سچ رہے لیکن انھیں اس کے ماننے جانے کا یقین بھی تھا۔ نظریہ اضافیت ہو یا جدیداتی کشمکش، ان کا روپ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ فن، فلسفے اور سائنس کے وہ تصورات جو زندگی کی ارتقائی جدوجہد سے وابستہ ہیں، پردوں سے باہر آکر رہے ہیں کہ ان میں انفرادی ریاضتوں کی حب و تاب، انسانی جدوجہد کی روشنی اور وقت کی سچائیوں کی جلوہ گری ملتی ہے۔ اغیار کا حد ہو یا اعجاز کی مشکلات ان سے گزرتے ہوئے قبول عام کا تصور جسے حافظؔ نے خدا داد کہا ہے، فن کی ایک بلند منزل ہے کہ یہ مثبت فکر اور اثباتِ زندگی کو حمد کرتا ہے۔ غالبؔ کی شاعری نے جو قانون

قالب... نظر اور طائر

باغبانی صحرا کسا تھا، وہ آج بھی دل نہیں ہے کہ اس سے زندگی کے دلوںے تازہ ہوتے ہیں۔ قالب نے اپنی شاعری سے جذبات، فطرت اور معاشرتی تصورات کو حتمی فکر کیا ہے۔ قالب کا شعر ہے جس میں جذبہ جمال اور غوغائے حیات کے عناصر موجود اور متحد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

یہ جہاں گری ہلکے حسد ز عشق

شورشِ اعدوز ز غوغای ہزار ست بہار





## افسانہ طراز غالب

عام گفتگو میں حقیقت اور افسانہ ایک دوسرے کی ضد سمجھی، لیکن فن کے دائرے میں حقیقت افسانے کی زنجائی رکھتی ہے اور افسانہ حقیقت کے عناصر سے جلا پاتا ہے۔ اولیٰ اصناف کی ترقی کے ساتھ افسانہ اور شاعری دو الگ الگ سانچوں میں وصل کئے گئے ہیں، لیکن قلیل تہذیب اور ابتدائے تہذیب کے دور میں فطرت کے قرب نے مشاہدے، تجربے اور تخیل کو انسان اور ملامتے انسان کی خصوصیتوں سے مجتمع کر کے شاعری اور افسانے کی سرحدیں ملا دی تھیں اور شاعر عالم فطرت اور انسانی زندگی کی صداقتوں کو پیش کرتے ہوئے افسانہ طرازی بھی کرتے رہے تھے۔ اسی ذہنی رویے نے اساطیر اور اذلیں تخیلات کو جنم دیا تھا۔ زبان اور اساطیر دونوں ماقبل تاریخ کی یاد دلاتے ہیں۔ نثر و تصورات، تہذیبی ارتقا کے ساتھ ظہور میں آتے رہے۔ لیکن استعاراتی تخیل انسانی وجود کی گہرائیوں سے ابھرتے ہوئے، حال و ماضی میں لغز رکھتا ہے۔ اس تخیل کی ان خصوصیات سے آمیزش، جنہیں سائنس دیکھنا لیتی اور سماجی علوم نے مئے جہات عطا کئے ہیں، انسانی تہذیب کے حال و مستقبل کی راہوں کو روشن کرتی ہے۔ حقیقت اور تخیل کے احراج کی پہلی لہر شاعری ہی تھی اور شاعرانہ افسانہ سازی اسی لہر کا کرشمہ کہی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ شاعرانہ افسانہ سازی انفرادی تخیل اور اساطیری یا داستان

عالم۔۔۔ نظر اور نگاہ

کردار تراشتے ہوئے بھی اجتماعی احساس سے لبریز رہی تھی اور تنشائی صورتیں بھی پیش  
اجتماعی کے مزاج، طرز فکر اور طرز اظہار کی نمائندگی کرتی تھیں۔ انسانی تہذیب کے  
فروغ سے منطق و استدلال اور استقرائی و احترازی فکر کی راہیں ہموار ہوئیں۔ ایمان  
اور مظاہر فطرت میں جہد ملی آئی۔ انسان اور کائنات کے رابطوں کے نئے زاویے ہائے  
نظر سامنے آئے۔ لیکن شاعرانہ متوازیات نے مثال، کنایہ، مجاز، رمز، تشبیہ، استعارہ،  
تشکیل اور علامت کے ذریعے انسان و فطرت اور گزشتہ تاریخ سے حال کی تہذیب کا  
تعلق قائم رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کے دائرہ کاوش میں روایت اور تصحیح بھی  
شامل ہیں۔ ان سے ماضی و حال کی مسافتوں میں انسانی زندگی کے تجربوں کے ارتقاء  
کی تلاش ہوئی۔ پھر انسانی زندگی کے کسی مجموعی تصور میں فرد کا کس بھی مکتا ہے۔ خواہ  
اس کی تعمیر طمانیت سے ہو یا اقراؤ اور گمبھوں کی بے چینی اس کے لیے اسی حیثیت  
رکھتی ہیں۔

عالم کے دور میں پیش تر وہیں اس مصنوعی فضا کے سیر تھے، جس نے  
طمانیت کا سراپ دکھایا تھا۔ لیکن قائم کردہ دیواروں کے دھنوں سے بے چینی کی ہوائیں  
آ رہی تھیں۔ پھر یہ ہوائیں آنسوؤں میں بدل گئیں، جن سے بہت کچھ ہمارا ہو گیا، مگر  
بعض وہی دیواریں بھی ٹوٹ گئیں۔ معاشرتی زندگی کی پیچیدگی و ابتری نے انسانی  
رشتوں کو متاثر کیا تھا اور ”عقل و علم اقلت“ کی وہ صورت پیدا کی تھی جو حواس و ذہنوں کو  
ابتدائی دور حیات کی سادگی کی طرف مائل کرتی تھی اور احتجاج کے راستوں کی جانب  
لے جاتی تھی۔ عالم نے اپنے معاشرے کی جن خرابیوں کی وجہ سے مغرب کی نئی  
سائنسی ایجادات کا غیر مقدم کیا تھا، وہی خرابیاں، پہلے ہی انھیں ایک ایسے تھکر کی جانب  
لے گئیں جو حال سے غیر مطمئن بلکہ بیزار تھا۔ ان کے زمانے میں تہذیبی کشش، وہ  
ادوار کی کشش میں تبدیل ہو گئی تھی اور انسانی معاملات کچھ ایسی ہیال صورت میں تھے  
کہ معین اقدار کی گرفت کم زور پڑتی جا رہی تھی۔ چنانچہ عالم کی شاعری میں جہاں  
انسانی آرزو بندی انھیں خیال پرستی پر آمادہ کرتی ہے، وہاں انسانی بے بسی انھیں ہستی



غالب .. نظر اور نگار

ایک نیم تاریخی یا افسانوی قصے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گردشِ جھٹوں کو چٹک ہائے لیلیٰ سے آشنا کرنا اور پھر اس سے ایسے نتیجے کا استنباط کرنا جو کائنات پر محیط ہو، غالب کی افسانہ طرازی کی ایک شکل ہے۔ کسی واقعے یا روایتی قصے کو اپنے تصور کے حوالے سے دیکھنا اور دونوں کو یکجا کر کے افسانوی شکل میں پیش کر دینا غالب کی طرزِ ادا کا ایسا پہلو ہے جس سے تاثر اور معنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ غالب بیانِ قصہ ہی پر اکتفا نہیں کرتے، ان کی افسانہ طرازی صورت کی مدد سے ان دور معنوں کی جانب اشارہ کرتی ہے، جہاں صرف مثال یا صرف خیال کے ذریعے پہنچنا ممکن نہیں۔

سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ غالب نے کہانی، افسانہ یا داستان کو حقیقت کی ضد کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ان سے اعتبارِ حال اور بیانِ صداقت ہی ان کی مراد رہی ہے۔ مثلاً:

کب وہ سنا ہے کہانی میری  
اور پھر وہ بھی زبانی میری

☆

تو وہ بدخو کہ تنہا کو تماشا جانے  
غم وہ افسانہ کہ آشتیہ بانی مانگے

☆

وہ بدخو اور میری داستانِ عشقِ طولانی

عبادتِ مختصرِ قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

لیکن غالب حقیقت کو پیش کرتے ہوئے، اس کے ساتھ جس طرح دوسری حقیقت یا حقیقتیں مربوط کر دیتے ہیں اور اسے مثالوں سے تقویت پہنچاتے ہیں، اس سے عصری، آفاقی اور داستانِ کئی پہلوؤں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اپنی سادہ صورتِ موازنہ و مشابہت میں بھی ایک خیالِ دوسرے خیال سے شگفتہ ہو کر غالب کی شاعری میں تجربہ

مثال دونوں کی صورت آفرینی کرتا ہے اور حقیقت کا رشتہ افسانے سے جوڑ دیتا ہے یا افسانے کو حقیقت کے مراطف کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

تا فسلے از حقیقت اشیا نوشید ایم

آفاق را مراطف عطا نوشید ایم

غالب کے یہاں حقیقت کا احساس افسانوی تخیل کو کم نہیں کرتا، بلکہ اس کے حدود میں وسعت کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ شاعری جو حقیقت کی جانب مرکوز ہو کر تخیل کی پرواز کو کم کر دے، غالب کی شاعری نہیں۔ اسی طرح ایسا تخیل جو حقیقت کو گرفت میں نہ لائے، غالب سے واسطہ نہیں رکھتا۔ پھر غالب کے لیے شاعری محض تاریخی یا دلوں کے سفر کا نام بھی نہیں۔ وہ ذاتی ارتعاشات اور جنسی مشاہدات سے کام لینا بھی جانتے ہیں۔ مگر وہ ایک ارتعاش سے دوسرے ارتعاش تک پہنچنے اور ایک جنسی مشاہدے کو دوسرے حسی مشاہدے کے روپ پر رد لاکر خیال و تصور کے چراغ روشن کرتے ہیں، عالم کو حلقہ دام خیال قرار دیتا، ان کے ایک احساس، ایک تصور کی تجزیہ ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں مادی حقیقتوں کی جلوہ گری بھی ملتی ہے اور وہ تیرہ شب میں سڑوہ صبح کی بظاہر بھی دیتے ہیں۔ وہ زندگی کے حسن سے بھی واقف ہیں اور بہار کو اس انداز سے آتے دیکھتے ہیں کہ سرور و نشاط شانی بن جاتے ہیں۔ وہ چشم و گوش کی راحتوں کا لحاظ رکھتے اور کہتے ہیں کہ:

ریحان وہ از بینا، رامش چکد از قلقل

آں در دو چشم آہن، این از پے گوش آور

البتہ ان کی نگاہ، حقیقت اور خیال کے درمیان جو واسطے ہیں، ان کا بڑی خوبی سے جائزہ لیتی اور ان کے حدود کا احاطہ کرتی ہے۔ پھر غالب کی شاعری ان فاسلوں کو جس طرز خاص سے پیش کرتی ہے، اسے ان کے کلام کا ایک اہم رنگ کہا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

وہم خاکے ریخت در چشم، بیاباں دیدمش

قطرہ بکداشت، بحر بے کراں نامیدمش

بادِ دامنِ زدِ بر آتش، نو بہاراں خواہد مش  
 داغِ گشتِ آں شعلہ، از مستیِ خواں نامید مش  
 قطرۂ خونے گمہ گردید، دلِ دانستش  
 سوچِ زہرا ہے بہ طوقاں زدہ، نہاں نامید مش  
 غرقمِ ناسازگار آمد، وطنِ فہید مش  
 کردِ شگلیِ حلقہٴ دام، آشیانِ نامید مش

اس لحاظ سے غالب کی شاعری میں ایک دوسرے سے پیوست افسانے اور حقیقت کے اجزا کو ان کی فلسفیانہ خیال آرائی، جس طرح زندگی کی مختلف صورتوں کا آئینہ بنادیتی ہے، اس سے ان کی شاعرانہ افسانہ طرازی میں معنویت کے نئے نئے رخ سامنے آتے ہیں۔ وہ فسانہ فسونِ باہل کو بھی نظام معنوی بنا دیتے ہیں۔

ان کا شعر ہے کہ:

نظامِ معنویاں از شرابِ خانہ تست  
 فسونِ باہلیاں، فصلے از فسانہ تست

غالب کی شاعری میں حقیقت اور افسانہ دونوں مل کر ان معنوں کی تشکیل کرتے ہیں جو حقیقت کی سطح کو نہیں، اس کی گہرائیوں کو پیش کرتے ہیں اور وہ بہ مختلف شاعر تحلیلات کو قصومات کی بلندیوں پر پہنچا کر انسان، فطرت اور معاشرے کے تضادات و تصادفات کو طرازِ فن اور ذہنِ بھر بخشنے ہیں۔

ارسطو نے شاعری کے افسانوی امکانات اور فلسفیانہ عمومیت کی بنا پر اسے تاریخ کی پابندی و اقلات سے زیادہ برتر ورجہ دیا تھا۔ وہ شاعری کے افسانوی میلان کو صحیح صورت قرار دیتا تھا۔ لیکن شاعرانہ افسانہ تراشی، زندگی کی حقیقتوں سے الگ ہو کر یا حقیقت کی کم گیری کی وجہ سے بنیادی و درخ حقائق یا شگلی نظر کا شمار بھی ہو سکتی ہے۔ یہ صرف ارسطو جیسا فلسفی ہی نہیں جس نے شاعری کے باہل افسانہ ہونے کی خصوصیت کو بیان کیا ہو۔ ڈائسن، جانسن اور ہربرٹ ریٹ جیسے ادیبوں اور ادب شناسوں نے بھی

انگ انگ تعبیروں میں اس صفت کا ذکر کیا ہے۔ البتہ ادب کی ایک صفت عصری احساس اور حسرت فکر و نظر بھی ہے، جو ذہنی جمود کو توڑتی اور ثروت خیال میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ نائب کی افسانہ طرازی کی کئی شکلیں ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں حکایات پیشیں سے بھی کام لیا ہے اور ان کے جادو کا اثر اپنی ذات میں محسوس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

گھوم تازہ دایم شیوہ جادو بیاباں را  
دلے در غولیش نظم کارگر جادوی آناں را

یہ سخن درابن پیشیں کی جادو بیانی کا بھی اعتراف ہے، مگر نائب کی جانب سے یہ ذہنی بھی کیا گیا ہے کہ ”مہاش نگر نائب کہ در زمانہ تست۔“ نائب نے شکلیں رنگ گراں اور حکایت صبر گرین پا بھی لکھی ہے۔ اپنی روداد لکھنے میں غریبہ مڑگاں کی رنجش سے ہر رگ خار کو قلم بنایا ہے اور دل سنگ میں رقص تان آذری کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ ان کی شاعرانہ افسانہ طرازی کے تذریعہ بلند مقامات ہیں۔ لیکن جب وہ جنوں کی حکایات غول چکان لکھنے میں ہاتھ قلم ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو گویا وہ اس آنے والے دور کی صدا بن جاتے ہیں جو جادو روایات سے مغرور اور قلم کا حرام ہے۔ اب روایات پیشیں بھی نئے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔ نائب کی ذہنی خلعتی اور افسانہ طرازی اب حقیقت احوال کی ایک نئی صورت کا نشان بن جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اگر دشمن بود کیرودار نہ دشمن  
وگر ز شاہ رسد ارمغان بگردانم  
اگر کلیم شود ہم رہاں سخن کلیم  
وگر غلیل شود سیمہاں بگردانم

☆

”کلکب ما تا کجاست ز دشمن چہ ہراس  
چوں فریہاں علم آراست، دشمناک چہ پاک

غالب... نظر اور نظارہ

کسی نے کہا تھا کہ آنکس برگ کی حرکت اس لیے محتمم ہے کہ اس کا صرف ۱/۸ حصہ پانی سے باہر رہتا ہے۔ آتش فشاں پر بھی یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کا باہر آنے والا لاوا اندر کی آگ کا حصہ قلیل ہوتا ہے۔ غالب کے دل میں بھی اپنے عصر کی صورت حال کے خلاف معلوم نہیں کیا آگ ہوگی کہ لفظوں کے لاوے نے یہ صورت افسانہ گزشتہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہاں غالبِ طلوت لٹھیں، پیسے چٹاں، پیسے چٹیں  
جاسوس سلطان در کہیں، مطلوب سلطان در بغل

غالب نے حالِ شہیدانِ گزشتہ کے لیے منجی حتم کو آئینہ تصویر نما پایا ہے۔ لیکن ان کی افسانہ طرازی حتم ہائے گزشتہ کی سرگزشت اور ناساہد شب و روز حال کی مزاحمت پر حتم نہیں ہو جاتی۔ وہ قانونِ باغ بانی صحرا لکھنے کے لیے ہر سر خار کو اپنے خوب دل سے آغوش کرتے ہیں۔ اس بیان کا حامل ان کا فارسی شعر بہت مشہور ہے، لیکن ان کے لیٹراکم معروف اردو شعر میں آئندہ کے جو امکانات مضر اور قییم کے جو نقوش ظاہر ہیں، وہ ان کے ادراک انسانیہ پر مبنی فضاہ آرزو بندی کو جداگانہ کیفیت بخشتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کانٹوں کی زہاں سوکھ گئی پیاس سے یارب  
اک آبلہ پا دانی پڑ خار میں آوے

غالب نے غزل کے محدود پیمانے میں جس طرح فساد طرازی کی شکلیں نکالی ہیں اور تمثیل و قییم سے جو کام لیا ہے۔ وہ ان کے حیرت انگیز فکری ارتکاز کو ظاہر کرتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو نے تو شاعری کی بنیادی صفت غنائیت اور اس کی امتیازی خصوصیت ہذت قرار دیتے ہوئے، اس کے نفسیاتی طور پر قائم رہنے کے مختصر زمانے کے اعتبار سے طویل قلموں کو اصطلاحی ضد کہا تھا۔ لیکن اس کے تصور شاعری سے ارجح، غالب کے اشعار غزل کا پیمانہ محدود ہے، ان کی فکری وسعت محدود نہیں۔ جہاں روایات پیشین کے بیان میں ان کے عصر کی کیفیتیں سمٹ آتی ہیں، وہاں خاموشی تھیہات و استعارات





کے ہاتھ، خارجی حالات کی آویزش اور انسانی تصورات کی آمیزش کو پیش کرتی ہے۔ اس میں زندگی کے شعور اور بصیرت کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے حتمی بلکہ حتمی ارتعاشات کی نشان دہی کرتے اور ان کی شاعری تخلیقی تجربے سے بھرپور تصورات تک پہنچتی ہے۔ ان کے افسانوی بیان میں اختراعی مزاج کی جھلک ملتی ہے اور یہ افسانوی اختراعی شاعری کے علاوہ ان کی زندگی میں بھی نمایاں رہی ہے۔ ان کی زندگی کی کئی حقیقتیں افسانے کے قالب میں ڈھل گئی ہیں اور انھیں داستانوں کے پڑھنے کا ذوق رہا ہے جس کا اظہار ان کے خطوط سے ہوتا ہے اور ان کی شاعری میں بھی داستانی کردار ملتے ہیں۔

ملا عبدالمصمد ہر مزدور مرنے والا تھا۔ داستان کے لیے اضافی قالب قاری دانی کی حقیقت، اس کی بنیاد ہے۔ لیکن ان کا اس بارے میں اظہار و اظہار افسانوی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کے طرز زندگی میں مالی مشکلات حقیقت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لیکن ان کے ایک خط کی یہ عبارت کہ ”میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں، تو، غالب کے ایک جوتی اور گلی۔ بہت اترتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور قاری داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ آئیے نغم الدولہ بہادر۔ ایک قرض دار کا گریباں میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوک مٹا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ انی حضرت نواب صاحب، آپ سلطنتی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے رحمی ہو رہی ہے، کچھ تو اسکو، کچھ تو بولو، بولے کیا، بے حیا، بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب، گندمی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، سید فروش سے آم، صراف سے دام لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا“ اپنے اندر افسانوی موضوع، قصہ، بیان، مکالمہ، آئینہ اسلوب اور انجام کے اجزا رکھتی ہے۔ غالب کے خطوط کا جائزہ لیا جائے تو ایسے متعدد پیرائے ملتے ہیں جو ان کے مزاج افسانہ طراز کی دلیل بن جاتے ہیں۔ غالب نے یہ لباس اوڑھا نہیں، بلکہ افسانہ طراز ہی ان کے مزاج کا جزو رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا اثر ان کے قلمروں

اور فقرہ تراشیدوں میں بھی نظر آتا ہے۔

افسانہ طرازی تو غالب کی اردو اور فارسی شاعری دونوں کا شیوہ ہے۔ لیکن فارسی اشعار میں کاوشِ تخیل کا اثر زیادہ ہے، اس کے برخلاف اردو اشعار میں بیان کی ایمانیت زیادہ نمایاں ہوئی ہے۔ غالب کی اردو شاعری کے آئینہ خانے میں بھی ہمیں تصورات و تخیلات کی تجریدات و تجسیمات نظر آتی ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ کرداروں، ماجراؤں، مکالموں، بیانوں، تاثراتی زاویوں، ایمانی صورتوں اور اشاراتی کیفیتوں کا بڑا اجتماع ملتا ہے۔ اگرچہ یہ سب مل کر اس نچ فکر اور طرزِ اظہار کا نتیجہ ہیں، جسے غالب کی افسانہ طرازی کہا گیا ہے لیکن ان میں بے ساختگی اور روانی غالب ہے۔ ان کے اس طرح کے متعدد اشعار گویا یہ افسانے کے اوصاف رکھتے ہیں۔ سادگی بیان کے باوجود یہ اکھرے اور سپاٹ نہیں، اپنے اندر معنی خیزی کی دنیا لیے ہوئے ہیں۔ ان کے اردو اشعار غزل سے کچھ مثالیں جو ”نگس کو باغ میں جانے نہ دیتا“ کی ذہنی ورزش سے مختلف اور انسانی تعلقات کے سیاق میں کہیں افسانہ کہیں جزو افسانہ کہیں زاویہ افسانہ اور کہیں ریکب افسانہ پر مشتمل ہیں، اس کی بڑی اچھی وضاحت کرتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

گدا کچھ کے دو چپ تھامری جو شامت آئے

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاساں کے لیے

☆

انہیں منظور اپنے زخموں کا دیکھ آتا تھا

اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شونی بہانے کی

☆

آنکھ کی تصویر سرتا ہے پہ کھینچی ہے کہ تا

جھ پھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

☆

ہے تو کر اب بھی نہ بنے ہات کہ ان کو  
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

☆

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا  
نہ کبھی جنازہ اٹھا نہ کہیں حزار ہوتا

☆

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے عجم  
میرا سلام کہج اگر نامہ بر ملے

☆

میں اور بزم سے یوں تھکے کام آؤں  
مگر میں نے کی تھی توپ ساقی کو کیا ہوا تھا

☆

میں نے بھٹوں پہ لوکیں میں اسد  
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

☆

مر گیا پہرہ کے سر غالب وحشی ہے ہے  
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

☆

قرض کی پتہ تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں  
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

☆

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے  
والا ہے تم کو وہم نے کس بچ دناپ میں

کہاں سے غامے کا دروازہ عالم اور کہاں واعظ  
پر اتکا جانتے ہیں کل وہ جانتا تھا کہ ہم اگلے

☆

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے طیر سے تھی  
من کے ستمِ عریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

☆

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ  
ہو کر اسیرِ داجت ہیں راہِ زن کے پاؤں

☆

قفس میں مجھ سے دودادِ جن کہتے نہ در ہم دم  
گرمی ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیان کہاں ہو

☆

بچکے ہیں نہ دلوں کے لیے ہم معذوری  
تقریبِ بکھ تو سرِ ملاقات چاہیے

☆

غیر بھرتا ہے لیے یوں ترے غلا کو کہ اگر  
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بتے

☆

مجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال  
کہ یہ کہے کہ سر وہ گزر ہے کیا کہیے

☆

وعدہ آنے کا وفا کیجئے، یہ کیا انداز ہے  
تم نے کیوں سوئی ہے میرے گھر کی درہانی مجھے

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں، آستان نہیں  
 بیٹھے ہیں وہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

☆

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو  
 وہ سن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

☆

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں  
 اُس در پہ نہیں پار تو کیجے ہی کو ہو آئے

☆

عجب نظام سے جہاد کے چلے ہیں ہم آگے

کہ اپنے سائے سے مرزا پاؤں سے ہے وہ قدم آگے

غالب کے اردو اشعار سے یہ مثالیں، اُن کی انسانہ طرازی کی اس خصوصیت  
 کو بہت واضح کر دیتی ہیں جو اُن کے کیفیاتی، تخلیقی اور تصوراتی اشعار میں ظاہر ہوئی  
 ہے اور ان سب سے غالب کی فکری بڑائی کا اثبات ہوتا، اور اُن کی اردو شاعری میں  
 کمالات کے جوہر نکلتے ہیں۔

غالب کے اشعار غزل کے محدود پیمانے میں نقشِ ریزہ کار کی حیثیت رکھتے  
 ہیں۔ لیکن ان میں خیال کی پرواز کے لیے بہت کچھ سوچو ہے۔ وہ کچھ جو اردو کی  
 بیش تر عیالہ مشوہوں میں کم ہی ملتا ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ:

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدیق و تفسیح

میرے اجمال سے کرتی ہے تراوشِ تفصیل

غالب کی شاعری میں حقیقی، تخلیقی اور تصوراتی عناصر کے احواج کو نہ  
 معاملہ بندی اور نہ خیال بندی کہا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ ان کی انسانہ طرازی ہے جو  
 جذبات اور افہام کی کشمکشوں کو پیش کرتے ہوئے اپنے عصر سے ہمراہ گزار رہی اور جس  
 سے نئی دنیاؤں کی خبر ملی۔

دراصل فنی شہ پاروں میں تخلیقی ذہن جس وحدت کی تلاش کرتا ہے، وہ نہ صرف انسانی فکر کے مختلف گوشوں کو خشک اور منظم کر دیتی ہے، بلکہ اعتبار فن کی مختلف صورتوں کو بھی ایک دوسرے سے قریب لے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری اور افسانے کے دو علاحدہ اسالیب ہوتے ہوئے بھی، فن کے بڑے نمونوں میں اکثر وہ سفارت باقی نہیں رہتی جو باہمی انظر میں ایک کو دوسرے سے یکسر جدا اور منقطع کر دیتی ہے۔

جانوروں کے قصوں سے لے کر رزمیہ داستانوں تک ہمیں انسانی زندگی کی ایک دوسرے سے پیوست ہوتی ہوئی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جدید دور میں نثر اور شاعری دونوں میں قدیم اساطیر سے بھی کام لیا گیا ہے اور نئے استادے بھی وضع کیے گئے ہیں۔ صرف شاعری ہی افسانے کی خصوصیت نہیں رکھتی، افسانوی ادب میں بھی شاعرانہ صفت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ کامیو، کافکا، ہمینگ وے اور متعدد ناول نگاروں کے یہاں اس صفت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسیلی بروئے (Emily Bronte) نہ صرف یہ کہ شاعرہ بھی تھی بلکہ اس کے ناول وورگ ہائٹس (Wuthering Heights) کو بھی بعض نقادوں نے شعر گوئی (Lyric) کی پرواز کہا ہے۔ مختصر افسانے میں بڑے افسانہ نگار زندگی کی وسعتوں پر حید لمحوں کی کہانی سناتے ہیں اور پیچوف جیسے کئیے والوں کے یہاں یہ کہانی شعریت کی حدود کو چھو لیتی ہے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ عالم کی شاعری زندگی کی کلیتہ سے سرکار رکھتے ہوئے، افسانوی بیان سے دامن کشاں رہتی۔ عالم کی شاعری ایک پرتصادم دور میں انسانی نارسائی کی صورت اور فنی انسان دوستی کے تصور کو پیش کرتے ہوئے، ایک ایسی تخلیقی وحدت کا نشان ہے، جس میں افسانہ طرازی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ عالم کا شعر ہے کہ:

پائے نور و طیلانی چو داری  
ہر عالمے ز عالم دیگر آباد ایست



## غالب کا تصورِ انساں

غالب (۱۸۶۹ء - ۱۹۷۹ء) ایک نئے دور کے خبر آور ہونے کے ساتھ ساتھ، تہذیب گزراں کی رسیدگی اور کمال کا نقطہ اختتام بھی تھے۔ ان کی شاعری میں ایک دور تہذیب کی پیدا کردہ چٹنگی اور لطافت کے ساتھ تختہ رسی اور شاعرانہ قوتِ محرکہ کا ایسا اجمال ملتا ہے جو اس سے پہلے نہیں پایا جاتا تھا۔ ان کی شاعری نوعِ انسان کا ایک ایسا آئینہ ہے جو اپنے دورِ تاریخ کی مخصوص کھینچوں کو مکشوف کرنے کے علاوہ ہماری انسانی زندگی کا منظرِ مسلسل بھی پیش کرتا ہے۔ ان کا تصورِ انساں اویہاتِ عالم کے بڑے ٹکینے والوں کی طرح پھر اس کی تصدیق کرتا ہے کہ انسانی صورتِ حال میں طریقہ اور حزیہ دونوں ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں۔ اسے بڑے دماغوں نے پہلے بھی محسوس کیا تھا، لیکن غالب کی سربلج حساسیت اور باریک امتیازات پر نظر رکھنے والی قوتِ اوراک نے انھیں ذہنی یا جذباتی انتہاسات کے بغیر جیتے رہنے کی طاقت بخشی ہے۔ پھر ان کی غلامانہ قوت نے اسے فن کے لطیف سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان کا تصورِ انساں روایتی تصورات کی جہوں میں اترتا اور اپنے لیے نئے اقدار کی تخلیق کرتا ہے۔ مصیبت، فلاکت، ناانصافی، شکست اور موت کے مشاہدوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی خوب صورتی کے جلد گزر جانے والے، لیکن وسیع نقارے، ان کے شاعرانہ شعور کو وہ میدانِ نظر



فراہم کرتے ہیں، جو اس سے پہلے اس طرح زیرِ نظر نہیں آیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات اور انسان کے داخلی اور خارجی وجود کی یہ ہم آہنگی غالب سے پہلے نہیں ملتی ہے۔ اسی لیے کسی ایک فلسفیانہ طریق فکر کی پابندی نہ کرتے ہوئے بھی غالب کی فکر میں صدیوں کے حادثات سمیٹے ہوئے انسان اور آج کے کوائف کے انسان میں مماثلت ملتی ہے اور ان کا تصور انساں اس مماثلت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں پائے جانے والے بعض فکری میلانات کے اختلافات، مسلسل بدلتی ہوئی حقیقتوں کا آئینہ ہیں لیکن ان سے خود غالب کے تصور انسان کی وضاحت ہوتی ہے۔ داخلی احساسات کے گہرے سمندر کی تہ میں اتر کر غالب نے بدلتی ہوئی سماجی حقیقتوں کے درمیان انسان کی جن نہ بدلنے والی خصوصیات کو چٹن نظر رکھا ہے۔ انہیں سے غالب کے تصور انسان کی تعمیر ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری میں جذبہ اور خیال یک جان ہو جاتے ہیں۔ غالب نے انسان کے منفرد، مقصود آخر اور نہ اشتقاقیت ہونے کے تصورات کو شگفتگی اظہار اور نہ دائمی احساس کے سانچوں میں اس طرح ڈھالا ہے کہ زندگی کی بصیرت میں اضافہ ہوتا اور جمالیاتی مسرت کی راہیں کھلتی ہیں۔ غالب کا دوبار سے تعلق رہا لیکن وہ دوبار سے باہر کے انسان کی زیادہ موثر تصویر کھینچ کر رہے ہیں۔ غالب کی شاعری وسیع معنوں میں انسانی فطرت اور انسانی تہذیب کی نیرنگی صفات کا ملاپ ہے۔ انسانی فطرت کے تناقضات اور انسانی صورت حال کے تضادات کو ان کی شاعری کے کثیرالہجات وسیع کھل میں ایسے شاعرانہ سلسلہ استدلال سے یکسو کیا گیا ہے کہ دل کش اور نظر افروز شعری حکیم وجود میں آگئے ہیں۔ اس فکری دنیا کے ساتھ غالب نے حقیقی دنیا سے سروکار رکھا ہے اور ان کی شاعری نے گزراہی ہوئی زندگی کے غلوں، تکلیفوں، مسرتوں اور محنتوں کو وسیع تر بنایا اور زندگی کے حقیقی مشاہدات و تجربات کو داخلی حقائق اور اوصاف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غالب اپنی عظیم القامت صلاحیت فکر کے اعتبار سے اب تک اردو اور فارسی شاعری میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی اردو شاعری کو (غالب کے "بگذر از مجنوں" اردو کہ ہے رنگ من است" کے اعتبار کے

غالب ... نظر اور طائر

باوجود کہ اس کی بنیاد کچھ اور تھی، کم ترچہ کا مستحق سمجھنا کسی طور بھی صحیح نہیں۔ جہاں ان کی فارسی شاعری اکثر مرتبہ روایاتِ اعتبار کا سہارا لیتی ہے، وہاں ان کی اردو شاعری احتجاجِ نظر کے ساتھ اعتبار کے لیے پیکر بھی ڈھالتی اور شاعرانہ زبان کی نئی تشکیل بھی کرتی ہے۔

غالب اس عہد میں پیدا ہوئے تھے جب برصغیر میں مثل حکومت یا زیادہ صحیح لفظوں میں رشک آلِ تیمور سلسلۂ خاندان کی برائے نام حکومت بھی قریب الاختتام تھی۔ حقیقی اقتدار پہلے ہی انگریزوں کو حاصل ہو چکا تھا۔ دہلی کی برائے نام مظاہر حکومت کے باوجود دہلی سے نکلنے تک انگریزوں کو بااختیار پا کر شاہ عبدالعزیز (۱۸۲۳-۱۸۵۶) ۱۸۰۳ء میں اپنے ایک فتوے کے ذریعے اس برصغیر کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ غالب کی شاعرانہ ہفت میں ان نتائج اور پیام آزمائش و اضطراب کے تار و پود گندھے ہوئے ہیں۔ لیکن غالب ماضی اور حال کی دو دنیاؤں کے درمیان مستقبل کے ابھرتے ہوئے نقوش کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ مستقبل کے ان نقوش میں صرف حکومت کی تبدیلی اور قائم شدہ نظام کے زوال کے خاکے ہی نہیں، نئی تہذیبی صورتوں کی مدح و ستائش بھی موجود ہے۔ کثیر الامدادی غالب کی صلاحیتِ نظر کی امتیازی صفت ہے اور اسے صرف اُن کے اشعار کے کثیر معنوں تک محدود کرنا درست نہیں۔ اس صفت کو غالب اپنے تخیل کی پوری ہمت سے بروئے کار لائے ہیں اور اسی سے ان کی شاعری میں معانی کی کثرت سے زیادہ زندگی کے حجاب و حجابِ جلوں کی کثرت ملتی ہے۔ جن سے ان کی محقق فکر نے دفنی افق روشن کیے ہیں۔ ان کی شاعری کثیر البہات ہے، صرف کثیر المعانی نہیں۔

غالب کی شاعری کے جبرخی عناصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اسی قدر بے معنی انسانی مسائل کی وہ تصویری تشکیل ہے جو شاعرانہ لطافت کے ذریعے وقت کے حدود سے گزر جاتی ہے۔ مشرق کی روح جو مظاہرِ مصوری اور مظاہرِ فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ زبانِ فارسی کے بڑے شاعروں کی شاعری میں ظاہر ہوتی ہے، غالب کی شاعری

پر ایک لازمی اثر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی بھی غالب کا مطالعہ کرنے والا ان اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ لہاسِ نظم میں پائیدار مضمون عانی کرتے ہوئے زندگی کے متضاد، متوازی اور محاذی رگوں پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس اثر سے آزاد بھی ہوئے ہیں اور تجربات کو پیش کیا ہے جو ان کی شاعری کا ایک اور وصف ہے۔ ان کے اشعار کی کثیر الجہاتی و مراحل اسی صلاحیت نظر کا کرشمہ ہے جو وسیع زندگی کا نگارہ کرتی ہے۔ ان کی اس صلاحیت نظر نے عی الخفاظ تراشی بھی کی ہے اور نئی خیالی تصویریں بھی بنائی ہیں۔ ان کے کلام میں ”ہمارا نگاہ دار وہم از خود جدا برقص“ کے متعدد انداز ملتے ہیں اور ان کی وضع کردہ خیالی تصویروں میں آشکار و نہشت معانی کی رنگ آرائیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا دنیا اور حقائق دنیا کا مطالعہ وسیع اور اکثر الجہات ہے۔ جہاں غالب نے قدم تہذیبی بنیادوں کو جذب کیا ہے، وہاں وہ پہلے شاعر ہیں جس نے مغرب کی سائنس اور تکنالوجی کے اثرات کو محسوس کیا۔ ان میں وہ ذہنی قوت ہے کہ وہ ایک نئے دور کے شاعر بن گئے ہیں۔ اقبال نے گوئے (۱۸۳۲-۱۷۳۹ء) کو ان کا ہم نوا قرار دیا تھا۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جو معاشرے کے زوال اور نئے خیالات کی پلغار میں مستحضر انسان اور نصیب انسان کے بارے میں سوچتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے انتکارات و تضادات کو اپنے شاعرانہ تخیل سے نئی ترحیب دی ہے۔ وہ گرم تماشا رہے ہیں اور ان کی نظریں کثرت نگارہ سے دا ہوئی ہیں۔ غالب نے اپنے دائرہ قصودات میں آدمی کے انسان بننے کے مراحل کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کے تصور انسان میں انسان وہتی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا شوق دیدار بلا بھی آنکھ ساماں بن جاتا ہے اور وہ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ غالب نے اپنے تخیلات و قصودات کو اعلیٰ حوصلانہ صفات کے ساتھ پیش کیا ہے اور انسانی ذہن کی تہوں تک رسائی حاصل کی ہے۔

غالب کے عہد کی شکستیں اپنی اہمیت کے اعتبار سے سلامی اور سیاسی زندگی کے وسیع سلسلوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ غالب کی نظر میں انسانی زندگی کا احساس سختی و دل

غالب .. نظر اور طالع

تھی، جہاں اُن کے قریبی ماحول کی نشان دہی کرتا ہے، وہاں اسے اس کیفیت وجود کا نتیجہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ جس نے حساس دلوں کو ہر دور میں مضطرب رکھا ہے اور جس کی جانب غالب نے ”مری قہیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی“ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ اس مادی دنیا میں انسان کی حقیقی صورت حال اور غالب کے انسانی عظمت کے تصور میں جو تصادم ہے وہ اگرچہ ان کے محسوسات کو بھروح کرتا لیکن ان کی شاعری کو رنگ و توانائی دیتا ہے۔ غالب کی اثر انگیز علامات درد بھی اپنے اندر جمالیاتی مسرت کا سامنا رکھتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر حصیں قاشائے گلستاں کی خواہش ہے تو آؤ اور ان کی خون میں غرقے کی کیفیت دیکھو۔

اگر ہوائے قاشائے گلستاں داری

یاد عالم در خون پییدم بگر

غالب کی شاعری میں انسانی صورت حال کی حتمیہ حقیقت دل پر اثر ڈالتی اور دہن کی لامعلوم اقدیموں سے سرگوشی کرتی ہے۔ وہ اس لائجل انسانی صورت حال میں مستغرق ہیں جو روزمرہ زندگی کا تجربہ اور ان کے دور تاریخ کی کیفیت کا عکس ہونے کے علاوہ ایک وسیع کائناتی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ جہاں وہ اس صورت حال کا ”یاد میں کس غریب کا عجب رمیدہ ہوں“ کہہ کر اظہار کرتے ہیں، وہاں وہ اس کا رشتہ آفرغش آدم کی روایت سے جوڑنے کی نظر بھی رکھتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ:

ہیں آج کیوں دلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اس بیان میں وہ جسارت ہے جو دہائی التماسات کو رفع کرتے ہوئے بھی ماحول اور تقدیر کی جبریت کے خلاف انسان کی غلطی و اسامی سہی کی عکاسی کرتی ہے۔ ماحول اور پہلے سے متعین شدہ راہوں کی کلفت و تاسف کے باوجود غالب زندگی کی تخلیقی جدی اضطراب سے وابستہ رہتے ہیں۔ لیکن یہ وابستگی قرار کی صورت نہیں، بلکہ عاجز زندگی کی آرزوئے تکمیل سے عبارت ہے اور یہی آرزوئے تکمیل ان کی روح



غالب ... نظر اور نگار

اعمال پیدا کردہ ہیں لیکن انسان تکسب کی حیثیت رکھتا ہے اور خالق و کاسب ہونے میں فرق ہے۔ لیکن اس فرق نے بھی راضیت اور محافظہ کاری کے دعوے وادوں کو مطمئن نہیں کیا تھا۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی (۱۲۰۹-۱۱۳۹ء) نے، جنہیں اسلام کا احیا کنندہ کہا جاتا ہے، ایک نوع جبریت ہی کی وکالت کی تھی۔ غالب کے ذہنی پس منظر میں خیال کے یہ سلسلے موجود تھے۔

غالب مذکورہ بالا خیالات کے سلسلوں میں کسی ایک سے قطعاً رکھنے کے خواہش مند نہ تھے۔ وہ آزادانہ طور پر اس عالم رنگ و احساس میں انسان کی مالکیج، خطا کو مشور فکر بناتے، اسے انسانی فطرت اور انسانی تقدیر کی پریشان کن صورت حال سے منسوب کرتے اور واقعیت و تصویریت کے درمیان روٹنا ہونے والی کشش کی پراثر شاعرانہ تصویر سازی کرتے ہیں۔ کسی ملک فکر کا کوئی بھی عمومی نقطہ نظر ہو، وہ دراصل خود انسان کی فطرت اور خصوصیت کائنات کی آمیختگی اور آویزش باہم سے وابستہ ہے۔ انسان کا گناہ، اگر اسے گناہ سمجھائے تو ایسا گناہ ہے جسے اس کے تصور حسن اور مادی صورتوں سے بغیر نکالنے کی خواہش کے عمل انتخاب نے زیبا بنا دیا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ خدا نے بہار پیدا کی، جو پھول کھلاتی ہے اور ان سے حظ حاصل کرنے کا گناہ ہم سے سرزد ہوتا ہے، جس کا مستغرق ہوتے ہوئے بھی وہ اسے لازماً صورت تخلیق سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن

بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم

غالب کو ان بندشوں سے جو انسان کی آزادی عمل میں رکاوٹ ہیں، آزاد ہونے کی احراقی تمنا ہے۔ تاہم وہ جانتے ہیں کہ زمین اور آسمان کے درمیان انسان فشار بے چارگی میں جتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

دافنم کہ دوپہر زمیں را بہ آسمان

آں گونہ دادہ اند مرا درمیان فشار

غالبؔ نے بڑی آگہی اور وسیع تحلیلی سے انسانی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور انسان کی پائندہاں کے خلاف آواز احتجاج بلند کی ہے۔ ان کے تجزیے نفس کی استعداد اور خارجی دنیا کی وسعت اور اک نے ان کے متفرع اور پرہائے شعری ہیکروں کو حزیے احساسات کی بڑی گہرائیوں اور شدتوں کا حامل بنا دیا ہے۔ مثلاً:

گر قناری میں فرمانِ نخلِ تقدیر ہے پیدا  
کہ طوقِ قری از ہر حلقہٗ زنجیر ہے پیدا  
☆

لرزتا ہے مرا دل ز صیغِ مہرِ درخشاں ہے  
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں ہے  
☆

کیا تھک ہم ستم زدگاں کا جہان ہے  
جس میں کہ ایک بیضہٴ سودِ آسماں ہے  
☆

دُھی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا  
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے  
☆

سر پر ہجومِ دردِ فرجی سے ڈالے  
وہ ایک مشعِ خاک کہ صحرائیں جسے  
☆

بے محشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کچے  
لے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ داؤگوں وہ بھی

غالبؔ محلی تصوف سے بہت دور تھے۔ لیکن اردو اور فارسی شاعری نے صوفیانہ اصطلاحات مثلاً احوال، مقامات، رضاء، فقر، فنا، حضور، غیب، علم، معرفت اور ترک کو عام

کر دیا تھا۔ غالب نے بعض اصطلاحات سے (بقول شیخ علی حسینی) برائے شعر گفتن کام لیا ہے۔ خصوصاً وہ وحدت الوجود کے تصور کو (جس کے مقابل مجدد الف ثانی نے وحدت الوجود کا تصور پیش کیا تھا) اکثر اپنے شاعرانہ مقاصد کے لیے کام میں لائے ہیں۔ مسلم تاریخ میں تصوف ہر درجے کے لوگوں کے لیے سہل تسکین رہا ہے۔ اس نے موجود صورت حال کے خلاف احتجاج اور اس صورت حال کے درمیان انسانی ہمدردی کی رجحان سازی بھی کی ہے۔ جہاں تصوف، تقویٰ کے طالبوں کا مرکز نظر رہا ہے، وہاں اس نے بعض صورتوں میں نقل و تقلید کا شیوہ بھی عام کیا تھا۔ اس نے انسانی حقیقت پر بھی توجہ کی اور وسیع الشربہ کو رواج دیا۔ یہ تصوف کا قصور نہیں تھا کہ اس نے بعض جموں نے مذہبی بھی پیدا کیے، جن کے خلاف طرد بعض اہل تصوف کو آواز اٹھانا پڑی۔ تصوف کی آواز احتجاج کتاب سلطنت کا باعث بھی بنی ہے۔ غالب نے روایات تصوف سے کام لیتے ہوئے، اسے نئی جہت بھی عطا کی ہے۔ اس لحاظ سے وہ نہ اہل حال میں شامل ہیں اور نہ اہل قال میں، بلکہ ایک الگ وجہ رکھتے ہیں۔ غالب نے انسانی معاملات اور آماجگاہ کو عملی مقابل بنا کر روایات تصوف کو ایک نیا بعد عطا کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متعدد اردو اور فارسی کے شاعروں نے خصوصاً ان خیالات کے مقدم گفتوں سے روحانی آگہی کے بیدار کرنے اور احساس حسن کو وسعت دینے کا کام لیا ہے۔ انھوں نے انھیں مخصوص طرزِ تحسیس، شاعری یا شاعرانہ حکیر تراشی کے لیے بھی منبع اثر بنایا ہے۔ غالب کا انداز فکر جداگانہ ہے۔ وہ ان سے رو بہ جستجو و استہمام کو جگاتے ہیں اور روحانی تصورات کو باذی حالات کے بالمقابل رکھ دیتے ہیں۔ غالب نے بعض پرستی سوالات اور بعض ناقابلِ جواب سوالات پوچھے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے ذہن کے اعتبار سے بعض اوقات غالب طبعاً اشرافیہ کی فہم کی کرتے ہیں مگر ان کی انسانی ہمدردی کا دائرہ وسیع ہے۔ بعض صورتوں میں اشرافیانہ کیفیات کے مظاہرے کے باوجود ایک مفکر کی حیثیت سے انھوں نے کبھی انسانیت اور انسان دوستی کو فراموش نہیں کیا ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح غالب نے بھی حقیقت کو زبان و



مکان کی نسبت سے ماوراء اور لاصحد بتایا ہے لیکن ان کی خواہش مفرط نے جو مقام انسانوں کے لیے ایک مشحون معیار عرفیت کی جو یا تھی اور ان کی روزمرہ کی زندگی میں ایک مقدار مسرت اور حواس کی لذت لانا چاہتی تھی، ان کی شاعری کو لکھ کر زندہ کے لیے تحقیق و جستجو کا جاری رہنے والا چشمہ بنادیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی بعض انجانی مابعد الطبیعیاتی مسامی بلند میں بھی ہم انہیں ایسا عظمت پسند پاتے ہیں جو غیر روایتی نتائج تک پہنچنے سے خوف زدہ نہیں ہے۔ مادہ ایت پسندی ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ یہاں تک کہ وہ اکثر اہل دانش کو وضع کردہ پامال راستوں پر رواں پاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہیں اہل خود کس روش خاص پہ نازاں

پانچویں رسم و رواج عام بہت ہے

غالبؔ مابعد الطبیعیاتی یقین رکھتے ہیں لیکن ان کی فکر انسانی معاملات سے زیادہ مسلک رہتی ہے اور ان کا یہ اسلاک آنے والے عہد کا موضوع غالب بن جاتا ہے۔ اگر انسان وحدت الوجود کے سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت بھی رکھتا ہے تو غالبؔ منصور طابع (۱۹۳۲-۸۵ء) کی بیرونی نہ کر کے، اس سچائی کے عام اعلان سے انکار کرتے ہیں، کیوں کہ وہ قطرے کو سمندر جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو زیادہ صاحب احکام بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ہم کو تھلید تک غرق منصور نہیں

غالبؔ کا یہ ماوراء فردیت حوالہ انسان کی صلاحیت مازداری کو بھلا دیتا ہے۔ وہ جب اپنا کیش ترک رسوم قرار دیتے ہیں تو وہ مسلک وحدت الوجود سے مسلک ضرور ہے لیکن اس کا اصل حوالہ وسیع انسانیت اور عارف انسان کی وہ بے پناہ وحدت ہے جو دیر و حرم کو آئینہ ٹھہرا دیتا اور دماغ کی شوق کی پناہ کا ہیں سمجھتی ہے۔ اس کے برخلاف جو کچھ ہے وہ مصعب انسانیت کے مطابق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے

غالب۔۔ نظروں پر غار

واحد اور غیر منقسم وجودیت کے تصور کو اس امر پر زور دینے میں صرف کیا ہے کہ انسان کو خود اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے بالخصوص اور دنیا کے رنگ رنگ جلوں سے علی العموم زیادہ گہرے اور مستی خیز تعلقات رکھنا چاہیے۔

وحدت الوجودیت کے تصور کے برخلاف، جو ابن عربی (۱۲۴۰-۱۱۶۵ء) کے خیالات کا مرکزی نکتہ تھا، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (۱۶۲۳-۱۵۶۳ء) نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا اور وحدت الوجود کے تصور کو کائنات پرستی کا ایک انداز قرار دیتے ہوئے کہا کہ مابعد الطبیعیاتی حقیقت اولیٰ سے اتحاد کی حیثیت صرف شہودی کیفیت ہے، وجودی حقیقت نہیں۔ وہ ہمہ اوست کی بجائے ہمہ ازاوست کے قائل تھے۔ غالب نے حقیقت کی وجودی ماہیت کو تسلیم کیا تھا اور وہ ہمہ اوست کے نظریے کی جانب زیادہ مائل تھے۔ تاہم انہیں اس میں شک تھا کہ کائنات کو کسی صورت الہیت کی سطح تک لایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری و ہم

کردیا کافر ان اسنام خیالی نے مجھے

ان کا خیال آرا و ہم، کیش کارانہ قیاسات کی لین دین کی بجائے ان کے اختلافات اور تضادات کو معرض اظہار میں لا کر کسی مجموعی انسانی صداقت تک پہنچنا چاہتا ہے اور ایک انسانی خیال سے دوسرے انسانی خیال تک رسائی کی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔

غالب اجدے آفرینش اور سبب اول کی فلسفیانہ بنیادوں پر غور و تامل کی جگہ انسانی وجود کے مرکزی مسئلے اور انسانی صورت حال سے زیادہ سرگرم رکھتے ہیں۔ وہ وسیع الاخلاق قوت مدرکہ سے کام لیتے ہوئے دل اور دماغ دونوں کی تخلیقی اور اکتسابی صلاحیتوں کو اپنی اس فکر کا حصہ بناتے ہیں جس میں حیثیت محو و مدار کی حیثیت سے متحرک ہیں۔ اسی لیے غالب کی شاعری سے اس حیثیت کا سراغ بھی ملتا ہے جسے ہم جدید کہتے ہیں۔ البتہ آج کی جدید حیثیت پارہ پارہ اور فیض نا آشنا ہے لیکن فکر غالب



غالب۔ غزل، غزل، غزل۔

دُش اور خورشیدِ الاسلام کے انگریزی ترجمے میں کاغذم کردی گئی ہے۔ کیوں کہ جلتے ہوئے دلوں کو انسانوں سے نہیں دوسری مخلوقات سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

The dove is but a pinch of dust, the rightangle is a coloured form:

O Lamentation, what is there that shows the burning of their hearts.  
(Ghalib, Life and Letters, Ralph Russell and Khurshid-ul-Islam, Vol. I, p.39, 1969, England)

غالب نے مشورہ دیا تھا کہ معنی کی وضاحت کے لیے 'مئے' کی جگہ 'بڑا' پڑھا جائے، اس کے باوجود شعری سادگی میں انھوں نے 'بڑا' کے مقابلے میں 'مئے' کو ترجیح دی تھی۔ کیوں کہ صرف اسی لفظ سے شعر کی پوری معنویت روشن ہوتی ہے۔ یہ ایک مثال بھی غالب کی شاعرانہ پیکر تراشی اور معنی بخیزی کے کمرے قلم کی وضاحت کرتی ہے۔

غالب کے دل اور دماغ دلوں اپنے عہد کے اضطراب کو جذب کرنے کا وسیلہ بن گئے تھے۔ ان کے کاغذی پیکر تصویر میں خشکی اور خشک معنی سم ہونے کے متعدد رنگ جلوہ گر ہیں۔ جب ہی تو وہ کہتے ہیں کہ:

ہوئی جن سے تو فانی خشکی کی داد پانے کی  
وہ ہم سے بھی زیادہ خشک معنی سم لکھے

☆

سوج سراپ دھبہ وفا کا نہ پوچھ حال  
ہر ذرہ منگی جویر چنچ آہوار تھا

تاہم غالب دنیا کی تمام بے نظمیوں میں نظم و ترتیب کے لیے کوشاں رہے۔ غالب جو صابر کے سلسلے اہدائے سے منسلک تھے، اپنے قلم سے زمانے کی بے نرمیوں کے خلاف جنگ کر رہے۔ انھوں نے تاریکی، انحطاط اور جمی مانگی کی قوتوں کے سامنے شرمناک پیرائے خفی کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی۔ خود ان کی فکر اور ان کی شاعری زندگی کی بے معنویت کو بڑا چیلنج ہے۔ انھوں نے اپنے لفظوں کو معنوں کا خزانہ

غالب۔ نظر اور نگارہ

نگارہ یا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

تجلیۂ معنی کا ظلم اس کو کبھی

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

غالب کی فکر اور شاعری سے ہم پر یہ نکتہ روشن ہوتا ہے کہ انسان اگرچہ دائمی طور پر اشتکار اور سراسیمگی کے میدانوں میں ڈھکیلا جا رہا ہے، تاہم وہ امید مستقبل اور شعور انسانیت کے باعث فتح یاب ہوگا۔ اپنے انسان ہونے کے عمل کے ذریعے ہی وہ نکمری ہوئی راہوں کے چھیدہ جال سے باہر آئے گا۔ اس کا انسان ہونا ہی ایک ایسا وصف ہے جو وضع کردہ راہوں کے فریب پر حاوی آنا جائے گا۔ غالب کی شاعرانہ بصیرت میں جو انسان اور معاشرے کا ادراک رکھتی ہے، ایک نئے موسم خیال کی شمولیت ہے۔ وہ ”نہید می پریم راہ گرچہ پا نعلت“ کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ غالب کا کام دوسرے لکھنے والوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ کیوں کہ وہ جامد صورت حال کی ترجمانی کی جگہ اپنی توجہ، پوری تخلیقی قوت سے، انسان پر جو ساری تبدیلیوں کا سرچشمہ ہے، پیش روی کی غایت کو مدنظر رکھتے ہوئے، مرکوز کر رہے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے فنوں کی گریٰ نکالنا تصور، کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو عندلیب گلشنِ ناآفریدہ کہا ہے۔

ہوں گری نکالنا تصور سے نوزخ

میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب اردو شاعری میں جدید حسیت کے ساتھ جدید عصریت کے پیشِ روی ہیں۔ شاہ ولی اللہ (۱۶۲-۱۷۰۳ء) کے افکار، خصوصاً ان کے سماجی قوانین کے تصور اور ان کے انفرادی فیصلے یا اجتہاد کے اصول کی پہچان سے نئے خیالات کی حیات پذیری کی راہیں ہموار ہوئی تھیں۔ لیکن ابھی جدید عصریت کچھ دور تھی۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے برصغیر کو دہراغرب قرار دیا تھا۔ کیوں کہ نام کے لیے مسلم حکمران کے ہوتے ہوئے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا (برطانوی) اقتدار دہلی سے ٹکڑے تک پھیل گیا

غالب .. نظر اور طائرہ

تھا۔ خود پائے تخت میں بھی دراصل انگریز ہی مسلط تھے۔ تاہم بدلنے ہوئے حالات میں شاہ عبدالعزیز نے یہ دعاوت روا رکھی تھی کہ انگریزوں کی قائم کردہ درس گاہوں میں، اگر مسلم عقائد کے خلاف کوئی بات نہ ہو، تو تحصیلِ علم کی جاسکتی ہے۔ اسی شرط کے ساتھ وہ انگریزی زبان کو سیکھنے، کسی علم کو حاصل کرنے اور انگریزوں کی ملازمت بھی اسلام اور معاشرے کی بہتری کے لیے جائز قرار دیتے ہیں۔ سید احمد بریلوی کی سکھوں کے خلاف تحریک جہاد نے ۱۸۳۱ء میں ان کی شہادت کے بعد اور پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے نتیجے میں ایک نئی صورت اختیار کر لی تھی۔ تحریک جہاد بالآخر انگریزوں سے متصادم بھی ہوئی تھی، کیوں کہ نئی برطانوی طاقت برصغیر کی حاکم بن گئی تھی۔ جس کے خلاف ۱۸۵۷ء میں آخری کوشش کی ناکامی نے لوگوں کو بے حال کر دیا تھا۔ لیکن اس تمام عرصے میں شاہ ولی اللہ سے لے کر غالب تک آزادانہ دریافت کی روح متحدہ تھی صورتوں میں آشکارا ہو رہی تھی۔ شاہ ولی اللہ کو زیادہ فکر مسلم قوم کے مستقبل کی تھی، لیکن غالب کو انسان کی امید و ناامیدی اور دنیا میں انسان کے نصیب سے زیادہ سروکار رہا، جس سے انسان کا جبر و اختیار دونوں حالتِ فطرت و تصادم میں رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بس بھوم ناامیدی، خاک میں مل جائے گی  
یہ جو اک لذت ہماری سہی ہے حاصل میں ہے

☆

م گرفتاری میں فرمانِ نعلِ تقدیر ہے پیدا  
کہ طوقِ قری از ہر حلقہٗ زنجیر ہے پیدا

☆

لبِ خشک در خشکیِ مردگاں کا  
زیارتِ کدو ہوں، دلِ آرزوگاں کا

☆

لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود  
کسے خیر ہے کہ وہاں جھٹل لکھ گیا ہے

۱۵

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو  
کہ تارے کشیدہ، مگر انکب چکیدہ ہوں

غالب نے اپنے خطوط میں زیادہ اور شاعری میں کم حوادث کے بڑا راست تاثرات پیش کیے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے حادثے پر ان کا مشہور قطعہ (بسکہ فعال مایہ ہے آج، ہر سلیکٹر انگلستان کا) موجود ہے۔ وہ معاشرے سے الگ نہیں رہے۔ انھوں نے معاشرے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا خیال بھی رکھا تھا۔ لیکن ان کا مرکب نظر انسانیت پر ہے۔ وہ انسان کے درد کو محسوس کرتے تھے لیکن انسانی دردمندی کے ساتھ ان کی شاعری میں انسانی ہوش مندی کا جو پہلو ملتا ہے، وہ قومیت کے عام اور محدود تصور سے بالاتر ہے۔ ان کی شاعری میں ذہنی ٹھنکیں جو ارتقائی کو پیش کرتی اور انسانی ترقی کی سمتوں کی جانب گامزن ہیں۔ ان کے کلام میں خرد پروری اور اسی کی مناسبت سے سائنس کی جدید عصری ترقیوں کو ان کا حق لازم دیا گیا ہے۔ البتہ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب کے لیے قوت شعور انسان کی ذات سے الگ حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کی تیز بین اور واضح فہم مغرب کے لائے ہوئے نظریے کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کا تاثر مجموعی انسان تھا۔ مغرب کے اثر سے ماؤی حقائق میں جو تبدیلیاں آئی تھیں، انھیں غالب نے تعریفی طور پر ضرور پیش کیا ہے، لیکن یہ ان کے شاعرانہ تجربے کا بس ایک جزو تھا۔ اسی کو سب کچھ سمجھنا درست نہیں۔ وہ ہمہ گیر انسانیت کے مصعب اوج سے دنیا سے گرد و پیش کی حقیقت تھی پر نظر ڈال رہے تھے۔ اس جزو کی اہمیت کو کم نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس جزو کو غالب کے شاعرانہ شعور کے کل کی حیثیت سے تسلیم کرنا ایک بڑی نارسائی ہے۔ اگرچہ غالب کے اس پہلو کی تعریف کرنے والوں نے عموماً یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ انسان کی مجموعی حیثیت پر نظر رکھتے ہوئے بھی غالب کا بلاوا ماضی کی

غالب... نظر اور کتاب

طرف نہیں، مستقبل کی جانب تھا۔ اسی لیے سرسید احمد خاں (۱۸۹۸-۱۸۸۷ء) نے ابوالفضل کی کتاب "آئین اکبری" کی جو تدوین کی تھی، اس پر غالب نے بڑی قوت قاری اشعار میں انگریزوں کی لائی ہوئی سائنسی ایجادات کی تعریف کی ہے اور سرسید کو مردہ اور قلمرو نارساں ماضی سے وابستگی پر سرزنش کرتے ہوئے، مردہ پوری کو کار نامہ مبارک بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

صاحبان انگلستان را مگر  
شیوہ و انداز اپناں را مگر  
زیں ہنرمنداں ہنر نبیسی گرفت  
سعی بر چھینیاں نبیسی گرفت  
تا چہ انہوں خواندہ اند اپناں بر آپ  
دود کشی راجی راندہ وہ آپ  
نقد ہا ہے زمرہ از ساز آوردہ  
حرف چوں طائر پہ پرواز آوردہ  
چیں اپنی آئیں کہ دارد روزگار  
گشتہ آئیں دگر تقویم پار  
مردہ پودرون مبارک کار نیست  
خودنگو کاں نیز جز گفتار نیست

ڈاکٹر سید عبداللطیف، جو غالب کے مقامِ مرتبت کو کم کرنا چاہتے تھے، کہتے ہیں کہ (غالب، ڈاکٹر سید عبداللطیف، اردو ترجمہ: مصباح الدین قریشی، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۲ء، ص ۵۶-۵۵): "غالب میں ایک طرف تو رسمِ قدیم کی پابندی نظر آتی ہے اور دوسری طرف اس کھیر سے ہٹ کر خود اپنا ایک الگ راستہ بنانے کی محسوس مگر وہی ہوئی کوشش۔ اس آخری پہلو سے اگر اس کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ وہ مقررہ اوزان و بحر کی کوتاہیوں سے اپنا سر نہیں اٹھاسکا، البتہ گاہے گاہے مقررہ لفظیات



سے بلند نکل گیا۔“ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا موضوع نظر ”معزہ اوزان، صنائع بدائع اور تشبیہ و استعارہ کی تقویم پارید کی روایتی پابندی“ ہے۔ مگر غالب نے صرف شعر گوئی کی روایات نہیں، تہذیبی ثروت روایات کی بہترین امانت داری کے ساتھ اجتہادِ نظر سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کو یہ ماننا پڑا کہ ”موجودہ زمانہ میں رسم و قدامت کی دیکھیں آسانی سے توڑنی جاسکتی ہیں، لیکن اس زمانے میں خود غالب کے لیے جو حتی الامکان رسم پرستی کے خلاف جنگ آزما ہوتا تھا، یہ آسان کام نہ تھا۔“ بھٹوں گودکھ پوری نے انکار غالب کے سلسلے میں محاکمہ کیا ہے کہ (غالب... شخص اور شاعر، بھٹوں گودکھ پوری، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۹۹-۱۰۰)۔ ”غالب اور سرسید دونوں کو اس ثقافتی میراث کے زوال کا قلق تھا اور دونوں بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ میراث بچائی جائے۔ لیکن دونوں کو یہ بھی احساس تھا کہ اب محض پرانے ذرائع اور وسائل سے کام نہیں چل سکتا۔ غالب اور سرسید دونوں شاہ ولی اللہ سے لے کر سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید تک ان تمام مصلحین و مجاہدین کی مساعی کے دل سے معترف تھے، جنہوں نے مسلم علوم اور تہذیب و معاشرت کو بچانے اور زعمہ رکھنے کے لیے جاں بازان اقدامات کیے۔ لیکن نہ تو غالب ان اسلامی تحریکوں سے پوری طرح آسودہ تھے اور نہ سرسید ہی نے ان کو کافی و ثانی سمجھا۔“ بھٹوں گودکھ پوری نے سرسید کی فکر و بصیرت کے سلسلے میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ ”غالب کے پیش دس حراج کے قائل اور ان کے خیالات و میلانات کے گہرے اثرات قبول کر چکے تھے۔“ خلیلہ عبدالغفور نے لکھا ہے کہ (انکار غالب، خلیلہ عبدالغفور، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص ۱۲)۔ غالب کو زمانے کے بدلنے کا احساس تھا اور وہ اگرچہ گزشتہ تہذیب کی انہی اقدار سے انکسار نہ کرتے تھے، لیکن رد و ناسخ ہونے والے انقلاب سے ناخوش نہ تھے۔ خلیلہ عبدالغفور نے اس کا اضافہ بھی کیا ہے کہ لوگ سرسید احمد خاں کو نئے نقطہ نظر کا پیش رو جانتے ہیں، لیکن غالب اس معاملے میں ان سے آگے تھے، اگرچہ وہ اس کے لیے انہوں نے کوئی عملی قدم اٹھایا اور نہ نئے اثرات کو جگہ دینے کے لیے اپنے شاعرانہ راستے میں تبدیلی کی۔ یہ سارے

عالم... نظر اور نگار

بیانات اس کی تشریح کرتے ہیں کہ عالم اپنی تہذیب اور اپنے وقت کے محافل سے ہماری طرح باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ جتنی میں نگاہ رکھتے تھے لیکن شاید یہ بات ہماری طرح ظاہر نہیں ہوتی کہ عالم نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا اور جو کچھ سلسلہ تصورات قائم کیا، اس سب کو انسان کے واسطے سے جتنی کیا ہے۔ انسان ان کے لیے حیا کا نکتہ ہے اور خود کائنات، اپنی طبعیاتی اور مابعد الطبعیاتی صورتوں میں وصف انسان کو پیش کرتی ہے۔ ”گویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہونے میں تو کیا ہوتا۔“ انسان کی اسی، سماجی اور تاریخی محافل کے درمیان صوبہ فہم سہی، لیکن جہات ترقی میں اس کی منزلت قیاس کی حدود سے آگے ہے۔

عالم کے زمانے میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی بنیادوں میں آنے والی تبدیلیاں پورے برصغیر کے تمدنی دھارے کو بدلنے کے در پے تھیں اور اس کے لیے تمام تہذیبی اقدار کو نئے طور سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی۔ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں، مغرب کی طرف رجحان رکھنے والا ایک نیا حوسہ طبقہ ظہور پذیر ہونے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ عالم کی شاعری نے ہونے والی تبدیلیوں کے لیے ذہنی قوت متحرک فراہم کی اور اقدار و علاقے پر وقت نگاہی کے نئے دروازے کھولے۔ ان کی شاعری کے فکر گیر اثر نے قدیم تصوراتی دنیا کے ٹوڑنے میں مدد کی اور ایک ایسے انسان کی جھلک دکھائی جو پہلے سے بہتر، زیادہ آزاد اور قدامت سے دور معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں تھا۔ ”بامن میاویہ اے پد فرزند آذر را نگر۔“ عالم کی شاعری کے رنگ و ریخت میں انسان کی غیر انسانی صورت حالات کے خلاف جدوجہد سے پیدا ہونے والی حقیر اقدار کی معنی خصوصیت بے دست تھی۔ دراصل ان کے فن کی ارتقائی ست ہی یہ تھی۔ عالم کو اشیاء اور انسانی تعلق کے درمیان ایک نئے مفہوم کی تلاش تھی اور ان کی شاعری اسی مفہوم کو پیش کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہی۔

ہے موج زن اک قلم خوں کاش بھی ہو  
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

جدید عصرت کے نگارے کی قوت، پرستی اور اہم قہمی تھیں یہ ان کی شاعرانہ عظمت کا بس ایک رخ تھی۔ وہ شاعرانہ حیثیت میں کسی نگاہری تبدیلی کی بنا ڈالنے کی ضرورت سے سزا اور نئی شاعرانہ صورتوں کو بروئے کار لانے سے بے احتیاج تھے۔ کیوں کہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ خود بدلتے ہوئے حالات میں مضطرب انسانی روح کی داستان بنا رہا تھا۔ ان کی پیش کردہ ذہنی اور مادی حقیقتوں کے تصادمات نے ان کی شاعری میں نئے ابعاد حاصل کر لیے ہیں اور ان کی اعجاز کثیفہ آنکھ نے ابھرتے ہوئے امکانات کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ تبدیلی کے اس رخ کے طرف دار ہیں جو انسان کی اندرونی اور فحلی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے سرمد مساویں ہو۔ بدلتی ہوئی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے غالب نے اپنے دور کی نہایت اہم کشاکشوں کی ترجمانی بھی کی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ آگہی ان سے نئے نتائج اخذ کر سکی ہے۔ یہاں تک کہ حقیقت کے حقی خد و خال بھی ان پر مثبت تحولات کا انکشاف کرتے ہیں۔ (انہی سے کرتی ہے، اثبات تراوش گویا)۔ خاص کے حوالے سے وہ عام تک پہنچتے رہے ہیں اور عام کو ذات کے اعتبار کا سوڑ وسیلہ بنا کر وہ گویا انسانی وجود کی پیچیدہ صورت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا  
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا  
بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم  
آنکھ سے پھر آئے در کہہ اگر دا نہ ہوا  
بچنے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا  
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دیا نہ ہوا  
نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا  
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

مرتبہ احمد خاں پر تنقید کی ازلیب سے زیادہ (جس پر کئی لکھنے والوں نے

عالم .. فکر اور محاسن

زور دیا ہے) عالم کی جوہر عقل فعال کی قدر شناسی اُن کے اپنے زمانے سے آگے  
ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

چوں شود شام خم شمع فرد زنده یہ پیش  
از درخشندگی جوہر عقل فعال

عالم کے بہت بعد میں آنے والے اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۳ء) کی بین  
الاقوامی عظمت ایک مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ دراصل ان کا زمانہ اس اعتبار سے بھی  
مختلف تھا کہ وہ بین الاقوامی سامراجیت کے خلاف ایک جذباتی اور متحرک قوت کی  
ضرورت محسوس کرتے تھے۔ وہ ترک فکر کو مرکب عقل ضرور بتاتے ہیں لیکن عقل کو  
مسلماں اور عقل کو زحاری بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر شاہ ولی اللہ کی مسلم قومیت کے تصور  
کو پیش نظر رکھا جائے تو اقبال اس فکر سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن مجرد انسان اور تجرید  
فکر کو مبدیہ نظر رکھیں تو عالم نے غور پروری کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اقبال کے کلام میں  
عقل کے مقابلے میں عقل کا تصور زیادہ وسیع ہے اور اپنے وسیع ترین معنوں میں یہ  
زندگی کی سب سے متحرک قوت ہے۔ مگر وہ عقل کو رہنما اصول ماننے سے کسماتے ہیں  
اور جب وہ اسے باطنی تسلیم کرتے ہیں تو عقل کو عینا کل جذبے کا جزو ترکیبی بنا دیتے  
ہیں۔ پھر بھی عقل کی برتری قائم رہتی ہے کیوں کہ اقبال جس جرأت مردانہ کے طلب  
کار ہیں، وہ عقل مصلحت شعور کا شیوہ نہیں۔ وہ عقل و عقل کے بارے میں کہتے  
ہیں کہ:

اگرچہ عقل فسون پیش فکرے اکھنڈ

تو دل گرفتہ ناشی کہ عقل تھا نیست

اقبال عقل کو ذوق نگہ سے بے گانہ قرار نہیں دیتے لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ:

عقل ہم عقل است و از ذوق نگہ بے گانہ نیست

لیکن ایں بے چارہ را آں جرأت مردانہ نیست

اس کے برخلاف عالم کہتے ہیں کہ غرضقی میں بھی غور اپنی رہ نما رہتی ہے

اور اس کے بھٹکنے کی کیفیت بھی خود اپنے آپ کو پانے کی صفت رکھتی ہے۔

پہ صبحی غمور وہ غملائے غمور است

روزِ مگر نہ غمور ہم بجائے غمور است

اقبال نے ”مذہبی خیالات کی اسلام میں تکفیل تو“ میں خودی کے سلسلے میں کہا ہے کہ اس کا آخری عمل ذہنی نہیں بلکہ ایسا ذہنی عمل ہے جو خودی کے سارے وجود کو حقیق اور اس کے ارادے کو حیز کرتا ہے۔ (ترجمہ) وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا ایسی چیز نہیں کہ جسے تصورات کے ذریعے دیکھا یا جانا جائے بلکہ ایسی چیز ہے جسے مسلسل عمل کے ذریعے بتایا اور پھر بتایا جائے۔ اس لحاظ سے اقبال نے عمل سے اور عالم نے تصورات سے زیادہ تعلق رکھا ہے۔ لیکن اقبال کا یہ عمل تصورات سے خالی نہیں اور عالم کے تصورات اپنے اندر دنیا کو بدل دینے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ مگر عالم نے بعض شعری روایات کو بھی بدلا ہے یا ان میں نئی جہات کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً:

عشق و مزدوری عشرت مگر خسرو کیا طوب

ہم کو تسلیم کھوتی نرہاد نہیں

☆

مگنی تھی ہم پہ برقی تھکنی نہ طور پر

دستِ ہیں بادِ عرف قدحِ خود دیکھ کر

☆

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں

ہم اورچِ خالِ لعل و کمر کو دیکھتے ہیں

☆

اپنا نہیں وہ شہد کہ آرام سے نہیں

اُس در پہ نہیں بارِ تو کیسے ہی کو ہو آئے

☆

قد و گیسو میں قیس و کوکب کی آزمائش ہے  
جہاں ہم ہیں وہاں دار و دین کی آزمائش ہے

☆

کاشانہ ہستی کہ برآمدہفتی ہے  
یاں سوختی اور وہاں سائفتی ہے

☆

وفا داری بشرط استواری اصل ایمان ہے  
مرے بت خانے میں تو کبے میں گازد برہمن کو

☆

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے  
طراوت چمن و خوبی ہوا کبے

☆

بھوری و دوائے گرفتاری الفت  
دستِ جو سنگ آمد بیان وفا ہے

☆

تاب لاتے ہی جتنے کی غالب

واقعہ خست ہے اور جان عزیز

بہر حال یہ صرف شاعرانہ تخیلات میں عقلی رویے کی آمیزش اور مجموعہ عقل  
فعال کی جانب ان کا موازنہ طرزِ نظر ہی نہیں، جن سے غالب کی پیش روی کی  
خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا انسان اور انسان کے درمیان رابطوں،  
انسان اور معاشرے کی مظاہرتوں اور انسان و کائنات کے باہمی تصادمات کے سلسلوں کا  
شعور ہے، جو عصریت جدید کے پروان کردہ ذہن کے جن و اضطراب کا نشان دیتا  
ہے۔ غالب کی آواز پرانے اسلوبِ زیست کو چیلنج کرنے والی آواز ہے اور اس طرح وہ

ایک نئی شعری روایت کا آغاز کرتے ہیں۔ جس کے مختلف گوشوں کو یکدم بعد ہی نہیں بلکہ کافی بعد میں بھی آنے والے شعرا نے پیش کیا ہے۔ نقیض کی غالب سے اثر پذیری تو ان کے کلام کے مجموعوں کے عنوانات ”نقش فریادی“ اور ”دست در سنگ“ سے ظاہر ہے لیکن یہ صرف لفظیات اور تراکیب کا معاملہ نہیں، انسان کی الجھنتوں اور اس کے دوسوں اور غرضشوں کو غالب نے جس طرح اظہار بخشا ہے وہ جدید مصر کے شاعروں کے یہاں منکسر ہوا ہے، خواہ اظہار کی صورتیں بدل گئی ہوں۔ غالب جب کہتے ہیں کہ:

خزاں کیا، فصل گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو  
وہی ہم ہیں قص ہے اور ماتم بال و پے کا ہے

☆

تنگہ معمار حسرتہا، چہ آبادی چہ دیوانی  
کہ حراکوں جس طرف دا ہوں، بکف دامان صرا ہے

تو وہ انسان کی معاشرے ہی نہیں کائنات ارضی سے پیچ نکلتی کی داستان بناتے ہیں۔ لیکن غالب انسانی محبت، انسانی آرزو بندی اور سب سے بڑھ کر انسانی محبت کے فقر خواں بھی ہیں۔ البتہ دنیا کی وحشیانہ فیر انسانی صورت حال سے انسان میں سرایت کردہ کم زوریاں اور خامیاں بھی ان کی شاعری کے موضوعات کا حصہ ہیں۔ غلویت اور جلوت میں انسان کا کرب شدید، جس کا اظہار غالب کی شاعری میں ملتا ہے، وہ عصور میں آنے والا رجحان ہے، جو مصریت جدید کے حوالے کے تحت، انسان کی ہلکتی خیال کو ظاہر کرتا ہے۔ غالب نے مہم گزشتہ کے تقریباً تمام رومانی احساسات کو دور کر دیا ہے لیکن ان کی شاعری آخر تک شدید احساس اور دل سوزی کی حامل رہتی ہے۔ ان کے دنیا سے تمام تاذعات انسانی محبت پر مبنی ہیں جسے انھوں نے ایک رومانی تصور کی حیثیت سے نہیں، زندگی کی ایک برتر قدر کے طور پر دیکھا اور عقلاً قبول کیا ہے۔ اسی لیے معاشرے کی سب خرابیاں اور انسان کی تمام کم زوریاں بھی انسان کے

عالم - نظر اور محاسبہ

مرے کو کم نہیں کرتیں بلکہ اسے حائل کردہ تمام موانع کو دور کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ”ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سب گمراہ اور۔“ یہ ایک ایسا عمل ہے جو آدمی کے انسان بننے تک جاری رہے گا۔

انسان کو حیوانِ ناطق کہا گیا ہے، لیکن حالی (۱۹۱۳ء-۱۸۴۷ء) نے عالم کی محکمہ عجیبوں کے باعث انہیں ”حیوانِ ظریف“ بتایا ہے۔ خود حالی نے اصطلاح معاشرہ کی کوشش بھی کی تھی۔ عرفات کی اصطلاح اردو میں بذلہ نئی، مزاج، رجزیہ و مستویہ، طنز، پہلو و سخن، مصلح، شجاعت اور قولِ محال (Paradox) جیسے کئی عناصر پر محیط ہے، عالم کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان عناصر سے کام لیتے ہوئے، شاعرانہ طبعی طرزِابی کے حیرت انگیز اتصال سے وہ زندگی کے انوکھے زاویوں اور طبع کا نکات کے رنگوں کو پیش کرتے ہیں۔ عالم کا دائرہِ نظر وسیع ہے اور دلِ انسان کی بعض عقلی اور رجزیہ گہرائیاں ان کے طنز و مزاح کے ذریعے آشکار ہوتی ہیں۔ پھر وہ بعض تصورات کے تضادات کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ انداز یا ان کی عقلی طبع کا تجربہ کیا جائے تو ان کے ذریعے ان کے ذہن کی اعلیٰ صفت معرفت (Objectivity) ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود وہ ذوق و شوقِ زندگی سے مربوط اور تصورِ انسان سے وابستہ رہتے ہیں۔ انکی تصورِ انسان کا نکات کے تصور سے وابستہ ہے۔ سوکٹ (Jonathan Swift) نے کہا تھا کہ اس کا مقصد کبھی بدبالی (Malice) نہیں رہا۔ سوکٹ کا طنز اکثر زہرِ ناک کی حد تک پہنچا ہے لیکن اس کی قیامت انسان اور معاشرے کی اصلاح ہے۔

فریڈرک شلیگل (Friedrich Schlegel) نے عرفات کے ایک عنصرِ طنزیہ

رجز (Irony) کے بارے میں بڑے سچے کی بات کہی ہے کہ یہ اس ”حقیقت کی پہچان ہے کہ دنیا تناقض بالذات ہے اور تضاد پہلوؤں کی ایک جاتی کا انداز ہی اس کی تضاداتی کلیت کی گرفت کر سکتا ہے۔“ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو رجز و مسرت اور رجزیہ و طنزیہ کی سرحدیں ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ پھر عالم کی عرفاتِ انسان



اور معاشرے کے پُر تشاؤ پہلوؤں کی گرفت کے ساتھ ساتھ ایک کلاسیکی رخ بھی رکھتی ہے جو ہماری تہذیب کے خیر و شر کے تصورات اور خیال و احساس کی جمالیاتی آراستگی دونوں سے مشک ہے۔ اسی لیے غالب کی عرفیت ایسی عظیم طراوت ہے جو حقیقت اور خیال کی تکمیل کو اپنی خلافت شہیوں کے ذریعے شاعرانہ صفات سے متصف کرتی ہے۔ غالب جماعتِ انساں کے بارے میں خوش اندیش رہے ہیں۔ (اگرچہ اپنے بعض مشہور خطوط میں وہ کچھ کو برا کہتے اور برا نام دینے سے باز نہیں رہتے۔ بعض مقامات پر وہ حقیقت کو چھپانے یا حقیقت کو غلط رنگ میں پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لیکن نوع انساں سے ان کی وابستگی، ذات کی کم زوریوں اور معاشرتی تضادات کی مجبوریوں کے باوجود بھی غیر منقطع رہتی ہے) غالب اپنے خطوط میں مخاطب کو خوش رکھنے کی سعی کرتے اور شاعری میں مردم گزیدہ ہوتے ہوئے بھی اور "خونے آدم دارم آدم زادہ ام" کہنے کے باوجود انسانی ترقی کے امکانات کی نشان دہی کرتے اور کہتے ہیں کہ:

شوق ہے سماں طراز نازش ارباب مجز

دزدہ صحرا دست گاہ اور قطرہ دریا آشنا

ان کے خطوط بھی مجموعی طور پر سرنگی اعزاز سے انسانی وجود کے لیے محبت،

رم دلی، دل سوزی، امدادِ پامن اور خوش دلی سے پُر ہیں۔

غالب کو اپنے "دورۂ جم" سے تعلق اور "تڑک داؤ" و "ایک" ہونے پر فخر

تھا۔ غالب کے دادا مرزا قوکان بیگ ہندوستان وارد ہوئے لیکن غالب کے زمانے تک

بدلتی کا دور شروع ہو چکا تھا اور غالب ہی کے الفاظ میں اجداد کا حیر شکستہ ان کا قلم بن

گیا اور انھوں نے صورتِ معنی دکھانے کا کار نمایاں اختیار کیا۔ پہلے وہ پیچیدہ مضامین

میں داوِ دقیقہ بنی دیتے رہے، پھر زندگی کے حقائق، زندگی کی تعمیر ذاتی اور زندگی کی

آفاقی صداقتیں ان کا موضوعِ خاص بنیں۔ جن کو غالب نے اپنے تصور انساں میں

سمیٹ کر یہ ہزار آئینہ بندی پیش کیا۔ غالب نے ان جھپٹوں اور صداقتوں کو پیش

کرنے میں قرائعات و علامات سے بے احتیاج کام لیا ہے۔ سوسان کے لنگر (Susanne)

(K. Langer نے کہا ہے کہ (Problems of Art, P.23, 1957, Newyork) "استعارے کا اصول محض یہ اصول ہے کہ ایک بات کہی جائے اور دوسری مراد ہو، اور یہ توقع رکھی جائے کہ دوسری کے مراد ہونے کو سمجھا جائے گا۔ استعارہ زبان نہیں بلکہ ایک خیال ہے جسے زبان کے ذریعے ادا کیا گیا ہے۔ ایک خیال جو اپنی باری سے علامت کے طور پر کسی شے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ استدلالی نہیں ہے اور اسی لیے جس خیال کی وہ تمثیل کرتا ہے، اسے وہ حقیقت کوئی بیان نہیں بناتا۔ بلکہ ہماری بردار راست تخلیقاتی گرفت کے لیے ایک نیا تحکل ذہنی وضع کرتا ہے۔" (ترجمہ) غالب نے اپنی شاعری میں استعارات سے جو کام لیا ہے اور جس طرح شاعرانہ پیکر تراشی کی ہے، اس سے شاعرانہ معنویت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ مرنے پیدل میں رہتا گلے اور قاری شعرائے ماضی کی پیروی کے دور میں غالب نے خیال بندی کی جو تربیت حاصل کی تھی، وہ بالآخر زندگی کے رنگارنگ جلوں اور انسانی ہستی و معاشرے کے تضادات کو پیش کرنے میں بہت کام آئی۔ وہ تقلید و تربیت کی منزل سے جلد گزر گئے مگر اس نے ان کے شاعرانہ مشاہدے میں جو سامان طرازی کی تھی وہ زندگی کی آئینہ بندیوں میں صرف ہوئی۔ اس لیے جب وہ تضال تراشی کرتے ہیں تو ہمیں تلازمات خیال کا ایک جہان آباد نظر آتا ہے۔ ان کی علامات ناقابل اظہار وسعت رکھتی ہیں۔ مثلاً:

کہ وہ صرا ہمہ معنوی شوق بلبل

راہ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار

لیکن جب وہ سادگی بیان سے کام لیتے ہیں، اس وقت بھی ان کا سادہ بیان اپنے اندر پنہاں امکانات معانی کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے آپ کو ظہوری کے مقابل خفائی قرار دیتے ہیں لیکن یہاں خفائی صرف ظہوری کا مقابل لفظ نہیں بلکہ ان کی شاعرانہ خصوصیت کی طرف اشارہ بھی ہے۔ غالب نے اپنی شاعری میں مزاحمت اور تضادات سے جو جادو چکایا ہے اور اپنی شاعری میں لفظ کو جس طرح سمجھنے معنی کا حلسم بنایا ہے، اس میں ایک عمر کی شعری ریاضت کے ساتھ ساتھ زندگی

کے مشاہدات و تجربات کی دست بھی شامل ہے اور یہی مشاہدات و تجربات انہیں وہاں لے گئے ہیں جہاں بے ستوں آئینہ خواب گراں شیریں بن جاتا ہے اور کوہ کن گر نہ مزدور طرب کاو رقیب ٹھہرتا ہے۔ اسی سے ان کی شاعری میں ایک ایسے تصور انسان کے نقوش ملتے ہیں جو نہ صرف ان کے دوزر میں نیا تھا بلکہ جس کی آفاقی صداقت وقت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عیاں ہوتی جا رہی ہے۔

غالب کی عریضہ نگاہ کو بھی ان کی شاعرانہ دلچسپی نگاہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اس میں بھی قلق، شوش اور ساتھ ہی انسان کے دشمنوں کی سوزش کا اعجاز ہوتا ہے۔ وہ کبھی انسان کی وقعت کے تحلیل کو ابھارتے ہیں اور کبھی حقیقت واقعی کے تقابلی سے یا تہذیب نفس کے لیے اسے بدعاشی ہوئی سطح سے نیچے بھی لاتے ہیں۔ خود اپنی ذات کے لیے بھی ان کا رویہ عطف نہیں رہا ہے۔ ان کی شاعری سے سوردی بامطاعتوں اور خاموشی فرخوشوں کا پتا بھی چلتا ہے لیکن یہی شاعری سود اور حقیقت کے لیے بھی سنے سراغ فراہم کرتی ہے۔ انسانی غلطیوں اور غلطی ہائے مضامین کو دیکھنے کے حزیں اور طریقہ سلجھیدہ اور عریضہ نگاہ کوئی طریقہ نہیں لیکن ان کو جس طرح غالب نے اپنی شاعری میں یک جا کر دیا ہے، اس سے زندگی کی جامعیت، ہمہ گیری اور تضادات کا زیادہ بھر و کشاف ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی بے کرائی کو پیش کرتے ہیں لیکن زندگی پر چھائی ہوئی مرگ آسا کیفیتوں سے ان کا احساس شاعری خوب واقف ہے۔ ملکیتیں اور تہذیبیں مٹ جاتی ہیں اور غالب خود آفریقہ کے اجزا زوال آبادہ پاتے ہیں لیکن انسان اپنی تمام کم زوریوں کے باوجود انسانی رشتوں کے قطع سے زندہ رہتا ہے۔ اسی لیے غالب نے یہ بے مثل اشعار کہے ہیں:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے صخر  
نہ تم کہ چر بنے عمر چلداں کے لیے

☆

اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی ٹھہرائے گا کیا  
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہے ہیں

آرہ میں بحال سے فارغ نہیں ہوں  
بوس نظر ہے آنکھ دائم غلاب میں

☆

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں ناکل  
جب آنکھ ہی سے نہ چکا تو پھر لہو کیا ہے

☆

ہوں کو ہے نکلنا کار کیا کیا  
نہ ہو مرنے تو پھینے کا حرا کیا ہے

☆

فلس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ  
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

☆

کھٹے ہے جلوئے گل ذوق تماشا غالب  
چشم کو چاہے ہر رنگ میں دا ہو جانا

☆

ہے آدی بجائے خود اک محشر خیال  
ہم انجمن سمجھتے ہیں غلوت ہی کیوں نہ ہو

☆

یہ پروانہ شاید بادبان کشمکش سے فنا  
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

کبھی غالب ہزار شیوہ زندگی کے جلووں میں مضمر تاقصبات کا نہایت عین نظر  
سے جائزہ لے کر ان کی صفحہ خیز ہامطابقتوں کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی ان کا شعور  
لا پرواہانہ محض خوش ولی پر مبنی ہوتا ہے، لیکن کسی وقت بھی ہم اسے مینا کی نہیں کہہ سکتے۔

عالم دنیا اور کائنات کا نگار کرتے ہوئے بالآخر خود انسانی وجود میں بیست تضادات کا اوراک کرتے ہیں۔ وہ احساس اور ذہن کے اعتبار سے دوسروں سے افضل ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہیں جس کا انسان اور زندگی کا تاکہ حمایت اور دینی قوت سے بھرپور ہے۔ آدمی زندہ ریختہ زندگی کے ہاتھوں غم سہتا لیکن تمہیر نو کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ”وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے۔“ فطرت اور مظاہر کائنات سے لی ہوئی علامات اور اسطوری اجزا عالم کے مطالعہ انسان کو نئی وسعت بخشتے ہیں اور اسے انسان نامورائے انسان کی سطح تک لے جاتے ہیں۔ عالم کے زمانے تک اور موجودہ عہد میں بالخصوص انسان نے اپنی کائناتی قدر و قیمت کھودی ہے، لیکن عالم نے انسان کے حال اور اس کی کائناتی قدر و قیمت دونوں کو بالتحقیق لا کر انسان کی وقعت اور اس کی دنیاوی حیثیت دونوں کی آنکھ دہری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم کی غزل میں بھی شاعر کی ذاتی کیفیات سے زیادہ انسانی احوال کی ترجمانی کی گئی ہے اور یہ انسان ہے جو اپنی اچھائیوں یا پستیوں میں قہرمانی مقامات رکھتا ہے۔ عالم ذہن کی قوت کے فائن ضرور ہیں لیکن وہ دوسرے شاعروں یا مفکروں کی طرح خارجی حقائق کو محض ذہن کا آئینہ نہیں سمجھتے بلکہ وہ فن دینی اور مادی حقیقتوں کا اوراک رکھتے ہیں جو انسان کی عمر میں اور تکلیفوں سے علاوہ رکھتی ہیں اور انسانی رفعت کے امکانات کی راہ میں حائل ہیں۔ اس لیے ان کی آگہی خود اضطراب سے معمور اور ایسی انتہت کی حامل ہے کہ اس کا سامنا کرنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

پے سے کسے ہے طالعِ آشوبِ آگہی

کھینچا ہے بحرِ حوصلہ نے خطِ لیلغ کا

عالم ان شاعروں میں سے نہیں جو چھوٹی خوشیوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ چھوٹے غموں سے بھی بڑا اثر قبول کرنے والوں میں ہیں۔ پھر یہ غم تو بہت بڑا ہے کہ انسان دنیا ہی میں دوزخ کی سی زندگی بسر کر رہا ہے اور اسے ہر طرف بے رحمانہ اور غیر انسانی صورتِ حال سے واسطہ پڑا ہے۔ وہ انسان کے

عالم... نظر اور نگار

اس جہنم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں لیکن ان کی ظرفیت طہائی ایسے پہلو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو خوش دلی اور تسکین کا باعث بن جاتے ہیں۔ انسان کے غموں کی یہ وہ صفائی ہے جو غالب کی شاعری سے حاصل ہوتی ہے۔ غالب کا ظرفیت ملکہ اور گہری حس مزاج انسانی مصائب کو قاطب برداشت بنانے کا وسیلہ بھی ہے اور نہایت نامساعد حالات میں زندگی کی سرخوں تک پہنچنے کی کوشش بھی۔ ان کی شاعرانہ لحاظات "وقت کے اندر اور وقت کے باہر"۔

(A moment in and out of time, A moment not out of time but in time what we call history... T.S. Eliot, The Rock)

سے ایک لمحہ اپنی گرفت میں لے کر ایک ایسے ذہنی انداز کے ساتھ جو بیک وقت سمجیدہ بھی ہے اور ظرفیت بھی، اسے انسانی دانش تک پہنچنے کی گزرگاہ بنا دیتی ہے۔ غالب ان شاعروں میں سے نہیں جو کم شدہ جنت کی طلب میں بے یقین رہتے ہیں بلکہ وہ اس کا تو میراث انسان کے طور پر مطالبہ کرتے ہیں۔

خواجہ فردوس پہ میراث تمنا دارد

دائے گرد و روشِ نسل پہ آدمِ نرسد

اعلیٰ انسانی صفات کے لیے وہ بہشت کو دوزخ میں جھونکنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ اس سے بھی زیادہ ان کی وسعتِ نظر کی بے پاکی ان سے یہ کہلاتی ہے کہ میر و نظامہ کے لیے دوزخ کو بھی جنت میں شامل کر لیا جائے تو فضا کچھ اور کشادہ ہو جائے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یارب

میر کے واسطے قہوڑی سی فضا اور سخی

عالم جنت اور دوزخ کی سرحدیں مٹانے کے در پے ہیں اور اس طرح وہ

جدید صریحت کے اس حراج کی ترجمانی کرتے ہیں جو دلوں کو ہم پہلو پاتا ہے۔

عالم جس تمنائے تضادات کا نگارہ کردہ ہے، وہ نہ ان کے سلسلہ شوق

کو کم کرتا اور نہ ان کی تمنا کو مٹاتا ہے بلکہ ان کے وجود کی آگ کو ہلکانے کا باعث

بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

وہ حبِ شوق، ترنا ہے کہ بھر، صورتِ شمع  
شعلہ تا نہیں بھر ریشہٴ ودائی مانگے

غالبؔ عقلیت پسندی کی نکالت ضرور کرتے ہیں۔ لیکن عقل اور جذبے کے تضاد کو ان کی شاعری نہایت قوت سے پیش کرتی ہے۔ انسان متعدد تضادات و تضادات سے متحرک آرا رہتا ہے۔ غالبؔ کا انسان نہ تو فطری حالت میں وقوع پذیر ہے اور نہ مرتبہ اخلاقیات کا اسیر۔ وہ انسانی فطرت کے تقاضوں کی کشش بھی محسوس کرتا ہے اور مرتبہ نہ کسی اعلیٰ انسانی اخلاق کی تڑپ بھی دکھتا ہے۔ وہ یقین اور بے یقینی کی کشش میں دو برابر کی معاوضہ قوتوں کے درمیان معلق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ایساں مجھے روکے ہے تو کہیں ہے مجھے کفر  
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالبؔ کے نقطہ نظر سے انسان عقل ہی کے ذریعے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی ترقی فرد سے وابستہ ہے۔ لیکن غیر انسانی حالات اور خود اس کے وجود کی کششیں اور تضادات اسے بے لاس محاذوں پر مجبور کرتے ہیں۔ غالبؔ نے اس محاذوں کو آفاقی رنگ دے دیا ہے۔ پھر انسان دوسری مخلوقات کے مانند نہیں کہ جن کا دائرہ اور حدود بڑی حد تک متعین کردہ ہیں۔ وہ ایک تہذیبی گروے میں جیتا ہے اور تاریخ اسے آگے بڑھاتی ہے۔ اشیاء اور اشیاء کے بارے میں بدلتے ہوئے تصورات اسے سادگی سے پیچیدگی کی جانب لے جاتے ہیں اور اس کی سادگی کی ابتدائی کیفیات کو تمدن کی خصوصیات ذہنی سے آراستہ کرتے ہیں۔ چنانچہ غالبؔ پیچیدہ احساسات اور پیچیدہ تصورات کے شاعر ہیں اور انسانی حقیقت کے آگے کے سفر کی ان سے نشان دہی ہوتی ہے۔ ان کے لیے انسان وقت اور تہذیب، کبھی تاریخ اور تک و دوئے ترقی کی کشش اور اپنے احساسات و تصورات کے بارگاہوں سے گراں ہار ہے۔ ایسی صورت میں اسے درد سے بڑے کائنات کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ لیکن سب کے لیے ایک بہتر

غالب... فکر اور نگاہ

دنیا کے انتخاب کی انسانیت اسے بچاتی اور ماحول و روح کی تاریکیوں پر اس کی غفلت مندی کی دلیل ہے۔ وہ اس انتخاب کی انسانیت ہی سے سبک روح ہوتا ہے اور یہ سبک روحی راہ میں پیش آنے والے مصائب کا بار بھی ہلکا کر دیتی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ ان کی سبک روح کا بار ہلکا ہے تو کیوں نہ اذیت و آزار کو بھی ہلکا شمار کریں۔

سبک روحم بود بار من اندک

چرا خطاری آزار من اندک

یہ غالب کا حیات انسانی سے موافقت رکھنے والا فیصلہ ہے جو تمام ابتلاؤں کے باوجود انسان کا قصور، "نکات بداعترافی حالات" اور "قریب، خوردہ، ناسازگار شش جہات" کی حیثیت سے نہیں کرتا بلکہ وقت اور ماحول کے جبر سے انسان کی آزادی کی خواہش کو اظہار عطا کرتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو وہاں بھی کام کر دکھاتا ہے، جہاں محض سے کام نہیں نکلتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاؤں من ہو جائیں تو وہ سینے کے بل آگے بڑھتے ہیں۔

بودی کہ دریاں محض را عصا نخست

بسیدی پریم رہ اگرچہ پا نخست

غالب میں یہ صمت ہے کہ وہ نوع انسان کو قسمت انسانی کا راستہ بدلنے کا جلاوا دیں اور شراب کے قدح بزرگ کی گردش سے قضا کا رخ پھیر دیں۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانم

قضا پہ گردش رطل گراں بگردانم

غالب نے مستقبل کا نئی جلوہ تابانیوں کے ساتھ تصور کیا ہے لیکن مستقبل کو قریب لانے اور بصیرت جہاں کے پھول پھٹنے کے لیے انسان کا حال میں بیدار رہنا ضروری ہے۔ وہ کس خوبی سے کہتے ہیں کہ:

سحر و میدہ و گل در میداست شب

جہاں جہاں گل افکارہ چیداست شب



عصریت جدید کا ذہن احساسی تنہائی اور تصور تنہائی سے لبرخ ہے۔ غالب نے جہاں کوئی نہ ہو، ایسی جگہ رہنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اسے تسلیم کیا ہے کہ کوئی دوسرے کے مفہوم باطن سے باخبر نہیں ہوتا اور ہر فرد جہاں میں درق ناخواندہ کے مانند ہے۔ لیکن وہ اسے بھی مانتے ہیں کہ فرد جب اکیلا ہو، تب بھی اس کی ذات ایک محشر خیال کی حامل ہے اور اس لیے تنہائی بھی دراصل محفل بن جاتی ہے۔ غالب نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں کہ جہاں وہ نہایت موثر انداز میں انسان کی زندگی اور اس زندگی کے ہنگاموں کو پیش کرتے ہیں، مثلاً:

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے دامد؟  
غلط بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی  
☆

دھکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا  
معتق نبرد پیشہ طلب کار مرد تھا  
☆

خانہ زاد دلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں  
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا  
☆

شرح ہنگامہ ہستی ہے رہے موسم گل  
دھیر قطرہ بدایا ہے، خوشا سوچ شراب  
☆

کھینچے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں  
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے  
☆

کہتا ہے کون تارِ بلبل کو بے اثر  
ہوے میں گل کے لاکھ بجر چاک ہو گئے

کہوں نہ ٹوٹی طبیعت توڑ بیچائی کرے  
باندھا ہے رنگ گل، آئینہ تا چاک گھس

☆

زبانِ اللہ زبان میں ہے مرگ خاموشی  
یہ بات دم میں روشن ہوئی زبانی شرح

☆

بے شکل دیہۂ عاشق ہے دیکھا چلے  
کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوار بھی

☆

مستانہ طے کروں ہوں رو داری خیال  
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

☆

طاؤس خاک حسنِ فکر باز ہے مجھے  
ہر ذرہ جھک کر تازہ ہے مجھے

☆

رگ لیلیٰ کو خاک دھبہ مجھوں رہی بے  
اگر بوسے بھائے دانہ دھن تک گھر کی

☆

روزے رزم سے مطلب ہے لذت رزم سوزن کی  
کچھو مت کہ پاس دود سے دیوانہ قافل ہے

☆

دست گاہ دیہۂ خوں پار مجھوں دیکھا  
یک بیاباں جلوۂ گل، فرش پا انداز ہے

در پوزہ سماں ہا اے ہے سرور سامانی  
انجاد کریاں ہا در پردہ عربانی

☆

دعا جو تماشائے گلست دل ہے  
آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

☆

اے عنایب یک کعب خس بحر آشیان  
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

☆

حسن ہے پیدا غریب حراج جلوہ ہے  
آئینہ زائونے فکر اختراع جلوہ ہے

☆

سرور نئے گردش اگر کیفیت افزا ہو  
نہاں ہر گرد باد دشت میں جام سلائی ہے

☆

معلوم ہوا حال شہیدان گزشتہ  
تجلی ستم آئینہ تصویر نما ہے

☆

دل و دین نقد لا ساقی سے گر سودا کیا جا ہے  
کہ اس بازار میں ساغر حراج دست گرداں ہے

☆

ساقی بہار موسم گل ہے سرور بخش  
جہاں سے ہم گزر گئے، چنانہ جا ہے

عالم۔ نظر اور حاکم

مڑہ پہلوئے چشم، اے جلوہ ادراک باقی ہے  
ہو وہ شعلہ دلخ اور شوخی خاشاک باقی ہے

☆

ہسان سبزہ رگ خواب ہے زہاں ایجاد  
کرے ہے خامشی احوال بے خداں پیدا

☆

جادو بادہ نوحی دغاں ہے شش جہت  
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

عالم نے تصورات کے جن مختلف اور بھی کبھی متضاد سلسلوں سے رشتہ جڑا ہے ان سے ان کی شاعری میں وسعت آئی ہے۔ اور ان کے ذریعے عالم نے ترسیب اقدار کی جستجو کی ہے۔ انسان جب اقدار کی جستجو کرتا ہے اور یہ اقدار انسانیت پر مبنی اقدار ہوتی ہیں تو اس کی یہ جستجو صرف اپنے لیے نہیں ہوتی۔ کل نوع انسان کے لیے ہوتی ہے۔ اگر انسان نوع انسان کو پیش نظر نہ رکھے تو وہ حیوانی سطح پر ضرور انسان ہے۔ لیکن اسے انسانی سطح پر انسان نہیں کہا جاسکتا اور اسی لیے عالم کے لیے آدمی کا انسان بننا ہی علامت اولیٰ ہے۔

کھرٹیس (Lucretius) نے دعویٰ کیا تھا کہ کائنات انسان کے لیے تشکیل

نہیں دی گئی۔ ("The Universe not designed for man" - translated by W.E. Leonard) دوسری طرف سؤکھیس (Sophocles) نے کہا تھا کہ اس پوری دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز شے خود انسان ہے۔ ("Sophocles, Antigone" - translated by J.J. Chapman) پر پہنچی ہیں کہ انسانی مطالعے کا صحیح موضوع انسان ہی ہے، لیکن اس مطالعے کو کہاں سے شروع کیا جائے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذات کے علم کو اس مطالعے کی ابتدا و انتہا سمجھا گیا اور اس درمیان کو حصہ فائدہ روایات نے تقویت پہنچائی۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا

ہے کہ عقل یا وجدان کس 'دوسرے' سے یہ علم حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اس کی بنیاد دماغی استعداد پر ہے یا حواس پر اور ان حواس پر جو آسانی سے ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتے۔ اس الجھن میں 'غیر فانی روح' اور 'سیر جسم' کے دہرے تصور نے اضافہ کر دیا ہے۔ دور حاضر کی نفسیات، عمرانیات، بشریات اور دیگر سماجی علوم کی پیش قدمیوں کے ساتھ خود طبعیاتی علوم کے میدانوں میں ترقیوں نے اس بے چینی کو کم نہیں کیا، کچھ اور بڑھا دیا ہے۔ سائنسی ترقیوں کے ساتھ ساتھ علم کے خانوں میں بیٹ جانے اور انتہائی علوم کا عمل بھی ظہور پذیر ہوا۔ کارل گسٹاو یونگ (Carl Gustav Jung) نے جدید عصر کے روحانی مسئلے پر لکھتے ہوئے کہا تھا کہ "آدی جسے ہم منطقی طور پر عصر جدید سے منسوب کریں، تمنا ہے۔ وہ ناگزیر طور پر اور ہر وقت کے لیے ایسا ہوا ہے کیوں کہ ہر وہ قدم جو حال کے زیادہ بھرپور شعور کے لیے اٹھاتا ہے، وہ اسے انسانوں کے ہجوم میں شرکت پر اسرار (Participation Mystique) ایک اجتماعی لاشعور کی تہ میں اتر جانے سے... دور لے جاتا ہے۔" (ترجمہ) دوستوویسکی (Dostovesky) نے اپنی کتاب (Notes from the Under Ground) "زیریں دنیا سے نوٹ" (خلوط) کے کیفیات نامے میں کہا تھا کہ شاید انسان شیدائے عافیت ہونے ہی کی طرح شیدائے اعلیٰ بھی ہے۔ وجودی مفکرین جیسے البر کامیو (Albert Camus) اور ژین پال سارتر (Jean-Paul Sartre) نے مختلف معنوں کے امتیازات کے ساتھ بے معنویت (Absurdity) کی دکالت کی ہے۔ غائب کی شاعری انسانی اقدار کا حوالہ رکھتی ہے لیکن باطنی کے آسیب، حال کے اشتکار اور مستقبل کی سرکشگی اور ایک دوسرے سے بے پیکار تصورات کے نتائج سے انسان اس عاجزت و مفارزت کا شکار بھی ہوا ہے، جو قائم شدہ جہذبی رفتوں پر خطِ حقیق کھینچتی ہے اور حال و مستقبل کو بازوچہ دہشت و ہراس اور آئینہ تہذیب بنا دیتی ہیں۔ غائب جو جدید عصریت کے پیش رو ہے، کہتے ہیں کہ:

سرکشگی میں عالم ہستی سے پاس ہے  
شکلیں کو دے لویہ کہ مرنے کی آس ہے

کس کو شاؤں حسرتِ اعہاد کا نگہ  
دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

☆

رُخسِ ہوا ہے پاشنہ ہائے ثبات کا  
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے

☆

بے عشرت کی خواہشِ سالی گردوں سے کیا کیجے  
لے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

☆

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرای  
دل جھڑی گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

انسان کی اس پریشان کن اور خطرناک صورت حال کو قالب نے اپنے اشعار میں بار بار پیش کیا ہے۔ والٹر کاؤف مان (Walter Kaufmann) نے اپنی کتاب ”وجودیت... دوستوونکی سے سارتر تک“ میں انسانی فکر کی اس آفاقی خصوصیت کا جائزہ لیتے ہوئے اسے وجودیت کا نام دیا تھا۔ لیکن کسی فلسفیانہ طرزِ فکر سے منسوب نہ کرتے ہوئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ قالب اس جدید عصریت کی ترجمانی کرتے ہیں جو تہذیبوں کے لاگ اور لگاؤ کی صورت گری کرتی اور نئی صورت حال میں انسان کے یقین اور اس کی امید کے شکائات سے بے شاعرانہ ہیکر تراشتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

وے داد اے فلکِ دل حسرتِ پرست کی  
ہاں کچھ نہ کچھ خالی ماقات چاہیے

☆

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صرا  
گر نہیں شمع یہ خامہ لیلیٰ نہ سکی

رہا تیرے ایماں ذرہ سے صدا ہے  
انہی کو سرمے چشم آواز آٹھا ہے

☆

خانہ زاد زلف ہیں زنجیرے بھاگیں گے کیوں  
ہیں گرفتار وفا زعداں سے گھبرائیں گے کیا

☆

شرح ہنگامہ ہستی ہے ذہے موسم گل  
دہر قطرہ بددیا ہے خوشا سوچ شراب

☆

آزادی قسیم مبارک کہ ہر طرف  
نولے پڑے ہیں حلقہ دام ہوائے گل

غالب مسلم تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے آپ کو وہ ستموں کے درمیان محسوس  
میں جتا پاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی طبیعت ایران کی تہذیبی روایات کی جانب میل رکھتی  
ہے اور طریق عرب انہیں دہشت میں ملا ہے۔ پھر ایک نئی تہذیب اپنی جھلک دکھا رہی  
تھی اور انفرادی طور پر نامساعد حالات کا مقابلہ اس پر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔  
تاہم تہذیبوں کا اساطیر کرنے والی غالب کی وسیع قوت فہم اور بینش آنے والے عہدوں  
کے لیے ان کی سرچ صلاحیت جواب انہیں کثیر البہانی دانائی نظر کی جانب لے جاتی  
ہے۔ ان کی غور و فکر کی صلاحیت صرف جدید عصری میلانات کے تجزیے پر اکتفا نہیں  
کرتی، وہ احتجاج و بغاوت اور تہذیبی تعلق کے درمیان کثرت نگارہ کا ایک نیا ہل  
بٹاتے ہیں اور انفرادی محسوسات کو بھی وسیع نظر کا زاویہ بخشے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو  
تھک حدود سے آزاد کر کے پوری دنیا کی جانب دیکھتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ اگر حد  
نے تمہارے دل کو تھک و افسردہ بنادیا ہے تو اس وسیع دنیا کی جانب دیکھو کہ شاید  
کثرت نگارہ تمہیں وسیع نظر بنا دے۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو

کہ چشم نگ تک شاید کثرتِ نظارہ سے دا ہو

غالب خود آگاہی سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کی آگاہی کا راستہ فکری راجحیت کی جانب نہیں لے جاتا۔ وہ انتقادی ذات سے بیزار ہیں۔ ان کے لیے ذات اور کائنات دونوں فلسفیانہ صداقتوں کے ساتھ سائنسی حقیقتوں کی بھی مظہر ہیں۔ اس صورت میں کہ جب بعض فلسفیوں نے ریاضی کی صداقتوں کو فلسفیانہ اصطلاحوں میں سمجھایا ہے، غالب کا زیادہ مشکل کام سائنسی سچائیوں کو اندرونی تجربوں اور شعری تشبیہوں سے متوازن کرنا بھی رہا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ضعف سے آنسو آہوں میں بدل گئے ہیں۔ گویا ہماری حالت نے ثابت کر دیا ہے کہ پانی ہوا ہو جاتا ہے۔

ضعف سے گریہ مہڈل پہ دم سرد ہوا

باور آہا ہمیں پانی کا ہوا ہو جاتا

غالب ان مفکروں میں سے ہیں جنہوں نے وجود کے ساتھ عدم وجود کو بھی اپنی فکری توجہ دی ہے لیکن وہ صرف یہ کہہ کر نہیں رہ گئے کہ وجود اور عدم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ نہایت شاعرانہ اعجاز سے وہ کہتے ہیں کہ ہستی بڑے سچ عدم سے یوں ظاہر ہوتی ہے کہ جیسے سر زلف محبوب اس کی معدوم کمر سے گزرے۔

کھلت ما بہ عدم نیز ہم چٹاں پیداست

بصورت سر زلف کہ از کمر گزرد

غالب کے لیے وجود اور عدم سے زیادہ اہم وہ کیفیت ہے جس سے انسان گزرتا اور تحمل و برداشت سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ اسی غزل کے آگے آنے والے ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ:

دماغ محرمی دل رساندن آساں نیست

چہا کہ بر سر خار از شیشہ گر گزرد

اس وقت بھی جب غالب انسان کو ہر لباس میں تنگ و محدود پاتے ہیں، وہ



انسانی فطرت پر نظر عینیت کی وحدیت کے بدولت، امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ انسان کو آزادی انتحاب کی طاقت حاصل ہے، خواہ اس کی یہ آزادی اس کے خلاف فیصلہ ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ ان تاریکیوں سے بھی جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، کسب نور کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی فکر غالبؔ کو اضطراب وجود کے منسروں سے آگے لے جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن صبح ماتم خانہ ہم

غالبؔ نے وجود کے تضادات کے حل کے لیے کسی ایک محدود یا مخصوص طریق فکر سے کام نہیں لیا ہے۔ لیکن انسان کو شدید کشمکشوں اور مضبوط بندشوں میں گرفتار پائکر وہ اس کے لامحدود امکانات کا ذکر کرتے ہیں۔ انسان کی ناامیدی بھی امید سے خالی نہیں۔ غالبؔ کی شاعری اس آماج آزادی کے نظارے کے لیے جسے جبریت (خواہ باہد الطبع جاتی ہو یا مادی) کی قائم کردہ حدود کے باوجود، انسان نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے، کافی بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ لیکن یہ انسانی آماج آزادی اپنے ماحول کی بہتری کی خواہش سے منسلک اور دوسرے انسانوں کی خیر خواہی سے اس طرح ہم رشتہ ہے کہ ایثار ذات سے انتہائی بھڑکی کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

آفستہ ایم ہر سر خارے پہ خونا دل

قانونا باغبانی صحرا نوشتہ ایم

۔ دراصل وجود انسان کے بارے میں فکر و چال کا سرا، خود عدم کے مستقبل کو باحرکت بنانے والے اثر سے مل جاتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ صاحب نظر ہجر کے دل میں جوں کا توں دیکھتا ہے۔

دیدہ در آنکہ تا نند دل پہ شمار دل بری

در دل سبک بکرو رقص بیتاب آزری

زندگی کے کرب کے پورے احساس کے باوجود غالبؔ ہر ڈالے میں قوت

غالب۔ نثر اور غزل

زندگی کا مظاہرہ دیکھتے ہیں۔ زندگی کی حیاتیاتی قوت، فطرت کے سب مظاہر اور انسان کے تمام اعمال میں اپنی تابش دکھاتی ہے اور انسان کو یہ وصف حاصل ہے کہ وہ اس کا ادراک کرتا اور اسے نوع انسان کے لیے سلسلہ نور بناتا ہے۔ اس سلسلہ نور سے جمالیات اور شعری جمالیات بھی الگ نہیں۔ اگر کسی کا نوع انساں کے لیے بہتر وصف زندگی سے بیان ہے تو اس کا چھوڑا ہوا درخش سوت کے بعد بھی فیض رساں رہتا ہے اور اس کا اضطراب سلسلہ زندگی بن جاتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ:

غبارِ طرفِ مزاجم بہ بچ و تابے ہست

ہنوز درِ رگ اندیشہ اضطرابے ہست

غالب کی ماضی سے بغاوت، ماضی کے حال سے قطع رکھنے والے شعور کے

خلاف نہیں، صرف اس کی ان بے جان صورتوں کے خلاف ہے جو انسان کی ترقی میں حرام ہیں۔ ان کی شاعری مثنوی مزاحمت تک محدود نہیں رہتی اور نہ صرف مقاومت مجاہد کی تصویر کشی کرتی ہے بلکہ عالم گیر تعالٰی اور انسان کی بھلائی کی جدوجہد پر مبنی مجرّد و مثبت اقدار پیش کرتی ہے۔ یہ اقدار تعیم کا رنگ لیے ہوئے ہیں اور ان سے ان کی شاعرانہ صورت گری میں جان آتی ہے۔ غزل گوئی خاص طور پر ان کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے کیوں کہ غزل جو عموماً تاثیر رکھتی ہے، اس میں ان کے شعور، بیان سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعرانہ علامات پر شکوہ ہر مندی سے تراشی گئی ہیں۔ وہ تقریباً ایک نئی زبان وجود میں لاتے ہیں۔ جس کی خصوصیت شیرینی سے زیادہ وقار و نزائت ہے۔ یہ زبان نہ صرف باقوت ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی اپنی الگ صفت رکھتی ہے۔ اس زبان میں تجربہ، فکر، احساس کی شدت سے پیوست ہے لیکن انسانی زندگی کو پوری آزادی تک پہنچانے کے جذبہ بے پایاں نے اسے اظہار کی نئی سمت بخشی ہے۔ غالب کے لیے یہ حرکت ہی ہے جو فطری عالم کو رنگ فراہم کرتی اور زندگی کو بہار بے خزاں بنا دیتی ہے۔ وہ بڑی فکری استواری سے کہتے ہیں کہ:

بیادِ دیکھست درِ می بزم بہ گردش

ہستی ہمہ طوفان بہار است۔ غزلاں بچ،

مذکورہ بالا شعر میں انسان کی خوش انہای کا جو تصور ملتا ہے، وہ انسانی تاریخ کے گہرے مطالعے کی شہادت دیتا ہے۔

اس محفلِ عالم میں غالب کے خیال کے مطابق انسان ہی تحریک انگیز قوت ہے اور انسان ہی نہ صرف تمام اعمال کی ناپ کا پیمانہ ہے بلکہ محسوسات و جمالیات اور ارتقا کے سب راستے اس کے ہی دم سے کھلتے ہیں۔ انسان خارق العادہ، روحانی لگاؤ اور بصیرتِ مقدرہ سے الگ ہو کر بھی اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کم انسان ہیں جو اس آزادیِ انساں کے محفل ہو سکیں لیکن غالب نے اپنی شاعری میں اس کی جلوہ سمانی ضرور کی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ پہلے ہوائے بہار میں ایسی سرسستی نہ تھی یہ تو ہماری شبنم سے دم صبح کی تر دماغی ہے۔ گویا انسان ہی روئی کائناتِ آفریدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بچیں از دنیا باز بہار ایسا ہر سرست نبود  
شبنم بامست کہ تر کردہ دماغ دم صبح

انسان کو ہر زمانے میں فطرت اور ماحول کی بہت سی بندشوں کے خلاف جدوجہد کرنا پڑی ہے لیکن ہر فصل نے تہذیبی ثروتوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ البتہ کبھی کبھی فطرت کی تسخیر انسانی ہیئتِ اجتماعی کی فائدہ رسانی کے حدود سے گزر گئی ہے اور بعض اوقات خود اس کے قائم کردہ ماحول کی بندشیں دم گھونٹنے والی بن گئی ہیں۔ افراد کے رویے بھی مختلف رہے ہیں۔ شاید طبعیات کا علم اور اس کے اصول چاننا آسان ہے لیکن انسان کے متعدد رویوں میں چپے ہوئے منہزات و محرکات کی واقفیت زیادہ مشکل ہے۔ کیا کامیو (Albert Camus) کے الفاظ میں کسی ایک کی معصومیت کے بارے میں بھی دوئی سے نہیں کہا جاسکتا اور سب کے جرم کو قطعیت سے بیان کیا جاسکتا ہے؟ شاید ایسا نہیں ہے۔ ہر دور تاریخ میں انسان دوستی اور انسان دشمنی کے مظاہرے ہوتے رہے ہیں۔ پھر پیش تر افکار میں بھی انسان کی یہ حیثیت مجموعی و منفی اور عددی ترقی کو مؤثر نظر رکھا گیا ہے البتہ کچھ کے لیے افراد، طبقوں یا قوموں کی خوش حالی

عالم... نظر اور نگاہ

غایت اول رہی ہے اور کچھ نے بنی نوع انسان کو قفس نظر دکھا ہے۔ اپنے ماحول کی پیدا کردہ بعض کم زوریوں کے باوجود بہتر سوچنے والوں نے عام انسانی زندگی کی بہتری کے بارے میں سوچا ہے۔ چنانچہ اسی سے انسانی تاریخ اور انسانی افکار دونوں کی جہات ترقی کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں میں ایسے مجتہدان فکر اٹھے ہیں، جنہوں نے انسانی محبت کے تصور کو عام کیا ہے اور جن سے انسان دوستی کی روایت کو فروغ ملا ہے۔ عالم بھی ایک ایسا ہی بڑا ذہن رکھنے والے فن کار تھے جن سے نہ صرف فن کے تخلیقی امکانات روشن ہوئے بلکہ ان کی فکر نے انسانوں کا انسانیت پر یقین بھی مستحکم کیا۔

بنی آدم میں سے کچھ دنیا کے نظام مقتدرہ کے بارے میں اطاعت گزاری کا روپ رکھتے ہیں اور کچھ نے بغاوت کا شیوہ اختیار کیا ہے۔ عالم نے دونوں واسطوں سے انسان کے بارے میں سوچا ہے اور پوری دنیا کو مرکز نظر بنایا ہے۔ جی نہیں عالم دوسری دنیا کو بھی اپنی ذہنی کیفیات اور اندازہ نتائج میں شامل کر لیتے ہیں۔ وہ دوسری دنیا کی اہمیت سے متعلق مسلم خیالات کو موثر درجہ دیتے ہیں لیکن وہ انہیں بے روک تخلیقی جہازوں کا وسیلہ بھی بنا لیتے ہیں۔ وہ مادی دنیا کو التماس سمجھ کر مسترد نہیں کر دیتے کیونکہ لطافت بھی بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اس دنیا کو دوسری دنیا کے لیے ترک کر دینے کے قائل نہیں۔ ان کی شاعری سے حواس کی لذتوں کی کشش کا اندازہ ہوتا ہے لیکن وہ حواس کی لذتوں کے مقام پر رک نہیں جاتے۔ حواس سے گزر کر وہ اوراک کی منزل پر پہنچتے ہیں اور اس اوراک میں دونوں دنیائیں شامل ہیں اور انسان مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ انسان ہی ہے کہ جس کو دونوں دنیاؤں سے محبت کا کام سپرد کیا گیا ہے اور جس کی وجہ سے ہر ذرے کے دل میں تمنا کی سرشاری ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

دل ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے  
کس کا دل ہے کہ وہ عالم سے لگایا ہے مجھے

غالب کے خیال میں ہستی کا ہنگامہ اور شور ہستی انسان کی ذات سے ہے لیکن دوسری دنیا کا راز یہاں بھی انسان ہی ہے۔ جس کے لیے تعب ووزغ جاوید بھی ڈرنے کی چیز نہیں اور جو عالم کا جزو ہوتے ہوئے بھی تمام عالم سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

زہبار از تعب ووزغ جاوید حسی  
خوش بہاریست کزو ہم فزاں برخیزد  
جزوے از عالم و از ہمہ عالم دشمن  
بھو موئے کہ تاں راز میاں برخیزد

در اصل غالب حقیقت اور مثال کی دوئی کو ختم کرتا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان دنوں و نیاؤں کی دونوں ہی تقسیم سے گزر کٹھنہ ایک ایسی ہستی ہے کہ جس کی وجود کی حقیقت دنوں و نیاؤں اور دوسرے عالموں پر کہ جو خارج از قیاس نہیں، حاوی رہتی ہے۔ انسان اپنی ماہیت کے اعتبار سے گزرنے اور آنے والی تمام صورتوں کا عجیب خاطر سے سامنا کرتا ہے اور یہ صورتیں اس کے دائرہ نظر کو وسیع کرتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

ہر برق کہ نظارہ گدازست نہادش  
بگداز و بہ پیادت ذوق نظرم ریز  
ہر جاہم آہے ست بہ حزن کاین ترن بخش  
از گلزم و جیوں کتب خاکے بہ سرم ریز

انسان کی جاں فانی اور حوصلہ نظری میں اس کی فرس روئی نظر آتی ہے۔ لیکن کیا انسان کو اطمینان خاطر حاصل ہو گیا ہے؟ عالم فطرت، خود اس کے بنا کردہ شاعری و معاشرتی ادارے، اور خلق کردہ دنیاؤں کے پیش کردہ مواقع اس کی مسئولیت کا بڑے بزرگ اور مہمات پسندی کو آسودہ نہیں کرتے۔ انسان کا سفر اختتام ارتقا کی جانب ہے، جہاں اس کی ہمت عالی اس کی رہ نما رہتی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ دنیا کے حاضر

غالب... فکر اور مطالعہ

اور دنیائے موعود کے نقد اور اوصاف کا حال معلوم ہوتے ہوئے بھی یہ میری ہمت جالی ہے، جو مجھے تقویت دے رہی اور میری نگاہ داشت کردہی ہے۔ ان کا شعر ہے کہ:

نہ د نقد دو عالم کی حقیقت معلوم

لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

غالب کا مطالعہ پوری انسانی زندگی ہی نہیں، اس کی ذہن کی رفعتوں کا

مطالعہ بھی بن جاتا ہے اور اس ذہن کے واسطوں سے ہم اس پوری کائنات سے آشنا ہوتے ہیں جو آج بھی اقبال کے لفظوں میں اس کی پلغار کی شہر ہے۔ آج کئی ذہنی

سلیلے انسان کو صرف معاشرے سے ہی الگ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس دور میں پہنچا دینا چاہتے ہیں جو ”پس انسان“ یا ”نا انسان“ کا دور ہے۔ انسان کا مستقبل ماہیں کن نہیں،

لیکن اسے ماہیں کن بنانے کے سارے حربے آزمائے جا رہے ہیں۔ آج تبدیلی کا عمل ان ہالا دست قوتوں کی گرفت میں ہے جو اپنے مفادات بچتے کے لیے دماغ سازی

بھی کر رہی ہیں اور انسان سے اس کا جو ہر فکر بھی چھین لینا چاہتی ہیں۔ انسان سے اس کا جو ہر فکر چھین لیا جائے تو اسے آسانی سے زیر کیا جاسکتا اور ہالا دست قوتوں کا

مغلوب بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن غالب صرف نام کے غالب نہیں، انھوں نے حقیقتاً انسان کا قلب چاہا ہے اور اس کے جوہر فکر کو ہلا بخشی ہے۔ کیوں کہ یہ جوہر فکر ہی انسانی

عظمت کی دلیل ہے اور آج جب تاریخ کے خاتمے کا اعلان کیا جا رہا ہے اور انسان کو روایت بنانے کے سامان ہو رہے ہیں، غالب اور غالب کی شاعری میں درخشندہ جوہر

فکر کے مطالعے کی ضرورت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ غالب ہمارے زمانے سے غمگین ہی نہیں ہیں ان کی شاعری کا جوہر فکر ہمیں انسانیت کی آفاقی صداقتوں کا نیا دور اک بھی

بخشتا ہے۔

انسان کی تحدیدات کا علم ہوتے ہوئے بھی غالب نے اسے عالی ہمتی سے

آگے بڑھتے رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ غالب کے تصور انسان نے اقبال پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اقبال نے عظیم آدم کے جو ترانے گائے ہیں، ان کی روشنی اور گرمی سے آگے

بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ اقبال کی طرح فیض بھی غالب کے طرز و آہنگ، ان کی شاعرانہ پیکر سازی اور سب سے بڑھ کر ان کے تصور انسان کی وسیع المشرقی سے متاثر ہوئے ہیں۔ فیض کی آواز بھی اس لحاظ سے احوال انسان کی تربیانی کی اہم آواز بن گئی ہے، جس نے بین الاقوامی رسائی حاصل کی ہے اور اس سے قوی تہذیب کے نقوش بھی روشن ہوئے ہیں کیوں کہ ہر نوع جبر پر خواہ موافق فطرت کا پیدا کردہ ہو یا معاشرتی نظام کا زائیدہ انسان غالب آنے اور اپنی حس و استقامت کے ذریعے اپنے وقار کا بے زور اثبات کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ غالب کی شاعری آج بھی انسانی وائٹس کی زندہ آواز ہے۔

غالب کا تصور انسان ہی ان کے شاعرانہ تخیل کو مرتکز اور جامع بناتا اور انھیں حلقہ پرواز عطا کرتا ہے۔ ان کے اشیاء ماحول اور واقعات کو جاننے کے تجربات و محسوسات، انسانی زندگی کا ایک ایسے جاری رہنے والے عمل کی حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں جو ناساھ حالات کے بدلتے ہوئے ذات اور ماورائے ذات کے رابلوں سے گزرتا اور اوجت و پیچاگی کے عالم میں بھی انسانیت کی آفاقی خصوصیات سے انسان کا دامن بھر دیتا ہے۔ ہر نسل ترقی کے سفر میں حصہ و موافقت کو دور کرتی اور اپنی روشنی آنے والی نسلوں تک پہنچاتی ہے۔ غالب کی شاعری بھی ایک منبع روشنی ہے۔ وہ کتنے صحیح طور پر کہتے ہیں کہ ان کی رفتار کی گرمی سے راستے کے کانٹے جمل گئے ہیں اور آنے والوں کے قدم ان کے مہوون کرم رہیں گے۔

خار ہا از اثر گرمی رفتارم سوخت

منجے بر قدم راہ رواست مرا



غالب اور اقبال دونوں بہت بڑے شاعر ہیں۔ دونوں نے صرف اردو ادب کو ہی نہیں بلکہ فارسی ادب کو بھی باثروت بنایا۔ دونوں کی شاعری اندر فکر و فلسفہ پر مقدار کے لحاظ سے اتنا کام ہو چکا ہے کہ کسی نئے گوشے، ذرا بے یا بکھنے کی گنجائش کم سے کم رہ جاتی ہے مگر پھر بھی ایک بڑا اور داخلی نقاد ان کی شاعری کے بحر بے کراں سے کوئی نہ کوئی گہر بنایا اب تلاش کر ہی لیتا ہے۔

غالب شناسی کے حوالے سے ڈاکٹر حنیف فوقی کی پیش نظر کتاب ”غالب، نظر اور نظارہ“ مطالعہ غالب میں چلنے والا ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ غالب اپنی حضرات شخصیت اور فکری میدان کے لحاظ سے منظر و انسان تھے۔ غالب کی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع بھی انسان ہے۔ انھوں نے انسان کے ظاہر و باطن اور داخلی و خارجی تھکد احساس کی لا تعداد چھوٹی چھوٹی طرح لفظوں میں وحال کر شعری بیکر تراشی کی ہے، وہ انھیں کا کمال اور بھال ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوقی نے اپنے وسیع تر مطالعے اور عالمی ادب کے پس منظر میں مطالعہ غالب میں جس وسعت نظر کو ملحوظ رکھا ہے وہ ادبی فکر کوئی مست مٹا کرتی ہے۔ انھوں نے جدید دور کے تقاضوں اور نئے شعرا فانی و معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کی تفہیم کی ایک جد اگات اور فکر انگیز کوشش کی ہے۔

